سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مُدیر: خرّم مُراد

اِدارۂ ترجمان القرآن



ماہنامہ

ترجمان القرآن

مدیر خرم مراد

جلد ۱۲۲ | مئی ۱۹۹۶ء، ذوالحجہ ۱۴۱۶ | عدد ۵

ترتیب

ادارتی امور

منصورہ، ملتان روڈ، لاہور ۵۴۵۷۰

فون: ۷۵۷۰۱۲۴

فیکس: ۷۸۳۲۱۹۴

انتظامی امور

۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

فون: ۷۵۸۷۹۱۶-۷۵۸۵۵۹۰

☆

قیمت فی شمارہ -/۱۵ روپے

زرسالانہ -/۱۵۰ روپے

مشرق وسطی -/۵۵۰ روپے

بنگلہ دیش، مسقط -/۴۵۰ روپے

بھارت -/۳۰۰ روپے

یورپ، مشرق بعید -/۶۵۰ روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا -/۹۰۰ روپے

○

بنک ڈرافٹ

بنام ماہنامہ ترجمان القرآن ارسال فرمائیں

۶۰ سال پہلے

کیا آپ مغربی معاشرت کے ان نتائج کو قبول کرنے کے لیے آمادہ ہیں جو یورپ اور امریکہ میں رونما ہو چکے ہیں، اور جو اس طرز معاشرت کے طبعی اور یقینی نتائج ہیں؟ کیا آپ اس کو پسند کرتے ہیں کہ آپ کی سوسائٹی میں بھی وہی ہیجان انگیز اور شہوانی ماحول پیدا ہو؟ آپ کی قوم میں بھی اسی طرح بے حیائی، بے عصمتی اور فواحش کی کثرت ہو؟ امراض خبیثہ کی وبائیں پھیلیں؟ خاندان اور عائلی زندگی کا نظام درہم برہم ہو جائے؟ طلاق اور تفریق کا زور ہو؟ نوجوان مرد اور عورتیں آزاد شہوت رانی کی خوگر ہو جائیں؟ برتھ کنٹرول اور اسقاط حمل اور قتل اولاد سے نسلیں منقطع کی جائیں؟ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں حد اعتدال سے بڑھی ہوئی شہوانیت میں اپنی بہترین عملی قوتوں کو ضائع اور اپنی صحتوں کو برباد کریں؟ حتیٰ کہ کم سن بچوں تک میں قبل از وقت جنسی میلانات پیدا ہونے لگیں اور اس سے ان کے دماغی و جسمانی نشو و نما میں ابتدا ہی سے فتور برپا ہو جایا کرے۔ اگر مادی منفعتوں اور حسی لذتوں کی خاطر آپ ان سب چیزوں کو گوارا کرنے کے لیے تیار ہیں تو بلا تامل مغربی راستے پر تشریف لے جایئے۔

لیکن اگر آپ ان نتائج کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، اور آپ کو ایک ایسے صالح اور پاکیزہ تمدن کی ضرورت ہے جس میں اخلاق فاضلہ اور ملکات شریفہ پرورش پا سکیں، جس میں انسان کو اپنی عقلی اور روحانی اور مادی ترقی کے لیے ایک پر سکون ماحول مل سکے، جس میں عورت اور مرد اپنے اپنے تمدنی فرائض کو بہیمی جذبات کی خلل اندازی سے محفوظ رہ کر اپنی بہترین استعداد کے مطابق انجام دے سکیں، جس میں تمدن کا سنگ بنیاد یعنی خاندان پورے استحکام کے ساتھ قائم ہو، جس میں نسلیں محفوظ رہیں اور اختلاط انساب کا فتنہ برپا نہ ہو، جس میں انسان کی خانگی زندگی اس کے لیے سکون و راحت کی جنت اور اس کی اولاد کے لیے مشفقانہ تربیت کا گہوارہ، اور خاندان کے تمام افراد کے لیے اشتراک عمل اور امداد باہمی کی انجمن ہو، تو ان مقاصد کے لیے آپ کو مغربی راستہ کا رخ بھی نہ کرنا چاہیے کیونکہ وہ بالکل مخالف سمت کو جا رہا ہے اور مغرب کی طرف چل کر مشرق کو پہنچ جانا عقلاً محال ہے۔ اگر فی الحقیقت آپ کے مقاصد یہی ہیں تو آپ کو اسلام کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔

(ابو الاعلیٰ مودودی: سود، پردہ، طلاق، مہر۔ جلد ۸، عدد ۳، ربیع الاول ۵۵ ۱۳ مئی ۷ ۱۹۳)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

کیا عدالتی فیصلہ ایک انقلاب کا نقیب بنے گا؟

خرم مراد

۲۰ مارچ کو صبح ساڑھے دس بجے کراچی میں' سپریم کورٹ کے ۵ رکنی فل بنچ نے ججوں کے تقرر کے بارے میں جو فیصلہ سنایا' وہ یقیناً عدلیہ کی آزادی کے لیے ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر اس فیصلے پر کماحقہ عمل ہوا۔ جو حکومت کی طرف سے عدلیہ کے خلاف جنگ چھیڑ دینے کی وجہ سے مشکوک لگ رہا ہے۔ تو کسی حکمران کے لیے مطلق العنان بننا انتہائی دشوار ہو جائے گا۔ یہ ممکن نہ ہو گا کہ وہ ججوں کو اپنی مرضی کا تابع بنانے کے لیے غیر آئینی اقدامات کرے جو موجودہ حکومت دھڑلے سے کر رہی تھی۔ عدالت نے حکومت کو پابند کر دیا ہے کہ چیف جسٹس پاکستان کے مشورے سے جج مقرر کرے' اپنے من مانے تقرر نہ کرے۔ قائم مقامی اور عارضیت کی تلوار ججوں کے سر سے اٹھائے' اور تین ہائی کورٹوں میں دو سال سے جو قائم مقام چیف جسٹس مقرر کیے ہوئے ہیں ان کی جگہ مستقل چیف جسٹس مقرر کرے۔ ججوں کو شریعت کورٹ میں بھیج کر ان سے چھٹکارا حاصل کرنے اور ان کے منصب اور مقام کو غیر محفوظ اور فروتر کرنے کو بھی اس نے خلاف آئین قرار دے دیا ہے۔

لیکن اس فیصلے کے مضمرات صرف ججوں کے تقرر اور عدلیہ کی آزادی تک محدود نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ وسیع اور دوررس ہیں' اتنے وسیع اور دوررس کہ وہ پوری قومی زندگی پر اثرانداز ہو سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ فیصلہ پوری قوم کے لیے ایک سنگ میل ہے' یاکم سے کم بن سکتا ہے۔ جن مسلمہ مقدمات اور آئینی دفعات کی صاف اور واضح تشریحات پر یہ فیصلہ قائم ہے' اور جو اس کے منطقی اور قانونی نتائج ہیں' اگر پاکستان کی عدالتیں پوری جرات اور استقلال کے ساتھ ان کی پاسبانی کرتی رہیں' اور ان کو ایک تسلسل کے ساتھ وسعت دیتی اور آگے بڑھاتی رہیں' تو وہ یقیناً اس یاس زدہ ملک کے اندھیروں میں امید کی شمع جلانے کا باعث بنیں گی' اور کیا عجب کہ وہ ایک ایسے آئینی انقلاب کی نقیب بھی بن جائیں جس کے نتیجے میں ملک کو قیام عدل کی نعمت عظمیٰ نصیب ہو جائے۔

اس فیصلے کو ایک تاریخی فیصلہ قرار دیا جا رہا ہے ' اور بجا طور پر دیا جا رہا ہے ۔ لیکن جہاں تک ججوں کے تقرر اور ان کے مناصب کو حکومت کی من مانی کارروائیوں کے چنگل سے آزاد کرنے کا تعلق ہے ' تو یہ تو کوئی غیر معمولی چیز نہیں ۔ یہ تو اتنا معروف و مسلم اصول ہے کہ ہر ملک جسے مہذب ہونے کا دعویٰ ہے وہاں اس کا اہتمام موجود ہے ۔ پھر صرف اتنا کرنا یہ بات یقینی بنانے کے لیے کافی بھی نہیں ہو گا کہ جج حضرات ' قانون کی حکومت قائم کرنے کے لیے اپنا آئینی کردار ادا کرنا شروع کر دیں ۔ اس لیے کہ جب ان کا تقرر اور منصب ' انتظامیہ کی دست برد سے محفوظ تھے ' تب بھی وہ اپنا یہ کردار پوری طرح ادا نہیں کرتے رہے ہیں ۔ اسی طرح یہ فیصلہ کوئی منفرد نوعیت بھی نہیں رکھتا ۔ آج سے ۵ سال قبل ۱۹۹۱ میں ' بھارت کی سپریم کورٹ بھی ایسا ہی فیصلہ دے چکی ہے ' جہاں کے دستور کی دفعات ہمارے دستور سے مماثل ہیں ۔ اس فیصلے میں کسی ایسی عدالتی فعالیت (Judicial activism) کا مظاہرہ بھی نہیں کیا گیا ' جس طرح کی فعالیت کے ذریعے امریکہ اور انگلستان جیسے ممالک میں عدالتیں ' دستوری اور سماجی نظام میں انقلابی تبدیلیاں لا چکی ہیں ۔ یہ تو دستور کی دفعات کی بڑی محتاط اور سیدھی سادی تشریحات پر مبنی ہے ۔ حکومت کی مزاحمت کی وجہ کچھ اور ہی ہے ۔

پھر اس فیصلے کی وہ کیا حقیقت اور نوعیت ہے ' جو اسے تاریخی بناتی ہے؟ ہمارے خیال میں ' سپریم کورٹ نے اس فیصلے کے ذریعے ' دراصل ملک کے اعلیٰ اور طاقت ور حکمرانوں کی مطلق العنانیوں ' قانون شکنیوں اور نظام و عوام کے خلاف چیرہ دستیوں کو لگام دی ہے ۔ ایسے حکمرانوں کو نہیں جو اقتدار سے ہٹ چکے ہوں ' بلکہ ایسے حکمران جو فیصلے کے وقت مسند اقتدار پر دندنا رہے ہیں ' طاقت کے نشے میں چور ہیں ' اور منتخب بھی ہیں ' گویا "جمہوری قبا میں دیو استبداد" بنے ہوئے ہیں ' (بلکہ دیوی کہا جائے تو زیادہ مناسب حال ہو گا) ۔ ایسے طاقت ور لوگوں کی قانون شکنی کو ' عدلیہ نے جائز قرار دینے یا اس پر لیپا پوتی کرنے کے بجائے دو ٹوک الفاظ میں قانون شکنی ہی قرار دیا ہے ' اور انھیں اس سے رک جانے ہی کا نہیں ' اس کا مداوا کرنے کا بھی حکم دیا ہے ۔

یہ بات بہت اہم ضرور ہے کہ یہ قانون شکنی --- جو اونچے لوگ تو ہر دائرے میں برابر کرتے چلے آ رہے ہیں --- اس دائرے میں روکی گئی ہے جو عدلیہ ہی کو تباہ کیے دے رہی تھی ۔ اس عدلیہ کو جو آئینی طور پر قانون شکنی روکنے کی ذمہ دار ہے ۔ لیکن اصل اہمیت اسی بات کی ہے کہ عدالت نے طاقت ور حکمرانوں کو بتایا ہے کہ وہ انھیں حکمرانی کرتے ہوئے قانون و انصاف کی حدود سے تجاوز کرنے کی اجازت نہیں دے گی ۔

عدالتوں کی جانب سے حکمرانوں پر قانون کی حکومت قائم کرنے کا کام بھی ' متعدد ممالک میں معمول کے مطابق ہوتا رہتا ہے ۔ اور ہمارے ہاں تو دستور کی دفعات ۱۸۴ اور ۱۹۹ ' واضح طور پر یہ کردار اعلیٰ عدالتوں کے سپرد کرتی ہیں لیکن جس بات نے عدالت کے اس فیصلے کی اہمیت کو کئی گنا بڑھا

دیا ہے' اور فی الواقع اس کو تاریخی بنا دیا ہے' وہ یہ ہے کہ نصف صدی میں یہ تیسرا ہی فیصلہ ہے' [۱۹۵۴ میں مولوی تمیز الدین خاں کیس میں سندھ ہائی کورٹ کے' اور ۱۹۹۳میں نواز شریف کیس میں سپریم کورٹ کے فیصلے کے بعد]' جس میں عدالت نے قائم و بااختیار' اعلیٰ ترین حکمرانوں کی دستور و نظام کے خلاف قانون شکنی کو قانون شکنی قرار دیا ہے' اور اس کا مداوا بھی کیا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ہماری عدالتی تاریخ میں اعلیٰ حکمرانوں کو قانون کی حدود میں رکھنے کی بھی بے شمار روشن مثالیں موجود ہیں' ہمارے متعدد جج بھی تابناک کردار کے حامل رہے ہیں' لیکن یہ قانون کی حکومت یا تو جزوی دائروں میں افراد اور اداروں کے حق میں قائم کی گئی' یا غیر حاضر و بے اختیار حکمرانوں کے خلاف۔ لیکن' ہم پورے ادب کے ساتھ کہنا چاہیں گے کہ' جہاں دستور و نظام کا مسئلہ ہوا' یا ریاستی اداروں کا' یا حکمران قائم و بااختیار ہوئے' وہاں عدالتیں نہ صرف اپنا آئینی کردار ادا کرنے سے قاصر رہی ہیں' بلکہ انھوں نے حکمرانوں کی دستور شکنی تک کو سند جواز عطا کی ہے۔ ۱۹۵۴ میں گورنر جنرل غلام محمد کی طرف سے ملک کی بانی دستور ساز اسمبلی کی برخواستگی کے کیس میں جسٹس منیر کورٹ کی طرف سے سند جواز عطا کرنے سے لے کر' ۱۹۹۴میں صابر شاہ کیس میں حالیہ سپریم کورٹ کی طرف سے حکومت کے غیر آئینی فیصلوں کی بالواسطہ تصویب تک ---یہ ایک طویل اور تکلیف دہ داستان ہے۔ حکمرانوں نے بار بار منتخب و مقتدر پارلیمنٹ کو کان پکڑ کے نکال باہر کیا' جو دستور ان کے وجود کا سرچشمہ تھا اور جس کے ساتھ وفاداری کا حلف وہ اٹھائے ہوئے تھے' اسی کو منسوخ کیا' معطل کیا' اس کی من مانی مرمت کی' بنیادی حقوق غصب کیے' خود عدالتوں ہی پر شب خون مارا۔ ان قومی جرائم کے مقابلے میں عدالتوں نے ہمیشہ فدویت کی راہ میں عافیت ڈھونڈی: انھوں نے ان اقدامات کو جائز ٹھہرایا' ان حکمرانوں کے ہاتھ میں وہ قانونی و آئینی ہتھیار تھما دیے جن سے انھوں نے آئین اور عدلیہ کا حلیہ بگاڑ دیا' ورنہ خاموشی اختیار کی۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ عدلیہ' قانوناً سب سے بالا مگر عملاً سب سے کمزور ادارہ ہے۔ اس کے پاس نہ فوج اور پولیس ہے' اور نہ خزانہ و مراعات' کہ وہ قوت یا ہارس ٹریڈنگ کے بل پر اپنی بات منوالے۔ ہم یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ بہت سے ججوں نے یہ راہ عافیت کوشی کی خاطر نہیں' خود کو بے بس پاکر اختیار کی ہو گی (جیسا جسٹس منیر نے اعتراف کیا)' اگرچہ بے بسی عموماً ایک معروضی حقیقت سے زیادہ اپنی نفسیاتی کیفیت ہوتی ہے' یا انھوں نے ملک کے مفاد میں بہتر سمجھا ہو گا کہ ان قانون شکنیوں کے آگے سر تسلیم خم کر دیں تاکہ حکومت اور عدلیہ کے درمیان محاذ آرائی نہ ہو۔ لیکن اس کی کیا تاویل ہو گی کہ ضمانت پر رہائی جیسے معمولی سے معاملے میں بھی' لوگ جانتے ہیں' اگر حکومت نہ چاہے تو سپریم کورٹ تک سے ضمانت ملنا محال ہوتا ہے۔ آج بھی بے شمار معروف لوگ طویل عرصے سے سلاخوں کے پیچھے ہیں' ان کے خلاف مقدمہ بھی نہیں چلتا' ان کو ضمانت پر رہائی بھی نہیں ملتی۔ بہرحال

وجہ کچھ بھی ہو ' یہ سب کچھ بے بسی کی بنا پر ہوا یا مصلحت کی خاطر ' ایک دردمند شہری بار بار یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر..... اگر.....

ایسے میں ' ہمارے نزدیک یہ فیصلہ دراصل اس لیے تاریخی ہے کہ سپریم کورٹ نے ' اپنی تاریخ میں دوسری دفعہ ' ایک مطلق العنان حکومت کو دستور شکنی سے روک دیا ہے۔

ہماری اس بات کی تائید محترمہ وزیراعظم اور حکومت کی روش کرتی ہے۔ اگر معاملہ صرف چند ججوں کے آنے اور جانے کا ہوتا تو وہ اتنی چراغ پا نہ ہوتیں ' یوں سپریم کورٹ کے خلاف جنگ نہ چھیڑتیں۔ یقیناً ان کے غصے میں اس بات کو بھی دخل ہے کہ۔ صدر ' فوج اور امریکہ کی تین اطراف سے اپنے کو محفوظ پانے کے بعد ' اور اپوزیشن کو کونے سے لگا دینے کے بعد --- اپنی مطلق العنانی کو مکمل کرنے کے لیے عدلیہ کو اپنے قابو میں کرنے کا جو منصوبہ وزیراعظم بنا رہی تھیں وہ اس فیصلے سے درہم برہم ہوتا نظر آ رہا ہے۔ لیکن اصل وجہ یہ ہے کہ وہ خوب جانتی ہیں کہ اگر ایک دفعہ عدلیہ نے حکومت کے فیصلوں اور اقدامات کو قانون کی ' بلکہ انصاف کی بھی ' ترازو پر تولنے اور غیر قانونی اور غیر منصفانہ اقدامات روکنے کے اختیار پر عمل درآمد شروع کر دیا تو پھر حکومت اوپر سے لے کر نیچے تک ہر دائرے میں قانون کا پابند ہونے پر مجبور ہوگی ' اور وہ کوئی من مانا کام نہ کر سکیں گی۔ ظاہر ہے وہ ایسی حکومت کرنے کے لیے نہیں "پیدا" ہوئی ہیں۔ ابھی تو وہ ٹائمز میگزین (لندن) کی طرف سے "دنیا کی طاقت ور ترین خاتون" قرار دیے جانے کے نشے سے مخمور ہی تھیں ' کہ سپریم کورٹ کے فیصلے نے ان کا مزہ کرکرا کر دیا۔ عدلیہ کے بارے میں ہی ان کے سنہرے خواب نہیں ٹوٹے ' مستقبل کے بارے میں بھی ڈراؤنے خواب ان کی نگاہوں کے سامنے آ گئے۔ اس لیے وزیراعظم کا ردعمل ہمارے لیے بالکل حیران کن نہیں ' بلکہ بالکل قابل فہم ہے ' اگرچہ انتہائی افسوس ناک ضرور ہے۔ وہ گربہ کشتن روز اول کے اصول پر عمل پیرا ہیں۔

ایک سانس میں وہ عدلیہ کی آزادی اور اس کے فیصلوں کی پابندی کا دم بھرتی ہیں ' دوسری سانس میں وہ سپریم کورٹ کے خلاف انتہائی گھٹیا اور رکیک لب و لہجہ اور الفاظ استعمال کرتی ہیں۔ وہ کچھ کہتی ہیں جسے اخبار نویس نقل کرنے سے بھی عاجز ہونے کا اعتراف کرتے ہیں۔ ایسی تصویر بنتی ہے جیسے کوئی روایتی جھگڑالو خاتون کھڑی ہیں ' چہرہ سرخ ہے ' رگیں پھول رہی ہیں ' منہ سے جھاگ نکل رہے ہیں ' اول فول بک رہی ہیں ' آستینیں چڑھی ہوئی ہیں اور ان کا بس نہیں چل رہا کہ سپریم کورٹ ' صدر ' اپوزیشن ' میڈیا اور جانے کس کس کا بھرکس نکال دیں۔

کبھی وہ صدر کے پاس جاتی ہیں کہ ججوں پر آئین سے غداری کے جرم میں مقدمہ چلایا جائے ' کبھی چیف جسٹس کو برطرف کرنے کا حکم جاری کرنے کا مشورہ دیتی ہیں۔ کبھی آرڈی ننس کے ذریعے

اس فیصلے کو کالعدم کرانا چاہتی ہیں ۔ کبھی کہتی ہیں کہ یہ فیصلہ غصے میں لکھا گیا ہے 'کبھی یہ کہ ذاتی انتقام کی خاطر ۔ کبھی کہتی ہیں کہ فرد واحد کی مرضی نہیں چلے گی ' پتا نہیں چلتا کہ فرد واحد سے ان کی مراد چیف جسٹس ہیں یا صدر؟ کبھی مقننہ کی آزادی و بالا تری کی دہائی دیتی ہیں 'جس سے ان کی مراد اپنی بالا تری ہوتی ہے ' اس لیے کہ پارلیمانی کابینائی نظام میں مقننہ اور حکومت یک جان و دو قلب بن چکے ہیں ۔ کبھی کہتی ہیں کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ حکومت پیپلز پارٹی کی ہو اور جج جماعت اسلامی کے لگائے جائیں ' اس طرح تو حکومت کا نظام تباہ ہو جائے گا ۔

ہم وزیراعظم کے ذاتی حملوں اور رکیک الزامات کو اس قابل نہیں سمجھتے کہ ان کا نوٹس لیا جائے ۔ ان کے بارے میں اخبارات میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے ۔ انھوں نے ' ان کے حواریوں نے ' اور چند سنجیدہ حلقوں نے اس فیصلے پر جو قانونی و آئینی اعتراض اٹھائے ہیں ' ان کا بھی کافی جواب دیا جا چکا ہے ۔ لیکن ان میں سے چند مباحث ایسے ہیں جن پر مزید گفتگو ضروری محسوس ہوتی ہے ۔ ان مباحث کا بڑا گہرا اور بنیادی تعلق ' ملک میں قیام عدل اور ایک اسلامی و جمہوری ریاست و معاشرے کے قیام سے ہے ۔

پہلا مبحث ایک منتخب ' جمہوری حکومت اور عدلیہ کے درمیان اختیارات کی تقسیم سے متعلق ہے ۔ اس فیصلے کے ساتھ ہی بڑے زور و شور سے یہ بات اٹھائی گئی کہ عدلیہ نے منی آئین بنایا ہے ' انتظامیہ کے دستوری اختیار پر پابندی لگائی ہے ' دستور کی ایک شق کو کالعدم قرار دے دیا ہے ' وغیرہ وغیرہ ۔ اصل ساورن (Sovereign ـ مقتدر) ادارہ پارلیمنٹ ہے جو عوام کی منتخب کردہ ہے ' آئین میں ترمیم اس کا کام ہے ' یہ فیصلہ ایک عوامی ادارے کے اختیارات میں مداخلت ہے ۔ شریعت بل کے وقت بھی پارلیمنٹ کے ساورن ہونے کا نعرہ بلند کر کے ' پورے پارلیمانی نظام کو شریعت کے دائرے سے باہر قرار دلوایا گیا تھا ۔ اس ضمن میں بار بار برطانیہ کی مدر (mother) پارلیمنٹ کی مثال بھی دی جاتی ہے ۔ وقت آ گیا ہے کہ پارلیمنٹ کی ساورنٹی کے افسانے (myth) کو بے نقاب کر دیا جائے ۔

پہلی بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں ' قانوناً ' اصل ساورن دستور ہے ۔ اس دستور میں پارلیمنٹ کی مطلق ساورنٹی اور بالا تری کا دور دور پتا نہیں چلتا ۔ یہ صحیح ہے کہ قانون وہی بنا سکتی ہے ' لیکن قانون کے دائرے میں عدلیہ کا اختیار اس سے بالا تر ہے ۔ عدلیہ کو دستور و قانون کی تعبیر و تشریح کا اختیار ہے ' اور یہ حتمی اختیار ہے ۔ حکومت اور پارلیمنٹ ' سب اس کی تعبیر و تشریح کے پابند ہیں ۔ عدلیہ ' عوام کی نمایندہ پارلیمنٹ کے منظور کیے ہوئے جس قانون کو دستور سے متصادم قرار دے ' وہ اس کو کالعدم کر سکتی ہے ' وزیراعظم کے وکلا یا ان کے جیورسٹ دوست کچھ بھی کہتے رہیں ۔ اسی طرح '

دستور کے مطابق، پارلیمنٹ کوئی ایسا قانون نہیں بنا سکتی جو قرآن و سنت کے خلاف ہو، نہ کسی صوبے کی اجازت کے بغیر اس کی حدود میں تغیر کر سکتی ہے۔ یہ عجیب بے بس ساورنٹی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ دو تہائی اکثریت سے دستور میں ترمیم کا اختیار بلاشبہ پارلیمنٹ کے پاس ضرور ہے۔ اس سے بظاہر یہ ثابت ہوتا ہے کہ حکومت، دو تہائی اکثریت کی بل پر، دستور میں جو چاہے ترمیم کر سکتی ہے۔ سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے کو بھی کالعدم کر سکتی تھی، اگر اس کے پاس دو تہائی اکثریت ہوتی۔ اس طرح بالآخر سب سے مقتدر حکومت اور پارلیمنٹ ہی ٹھہرے، کہ دستور کو بھی بدل سکتے ہیں۔

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ قانوناً حکومت الگ چیز ہے اور پارلیمنٹ الگ، اور حکومت پارلیمنٹ کے سامنے جواب دہ ہوتی ہے۔ لیکن ہم حکومت میں پارلیمنٹ کو شامل سمجھ کر بات کر رہے ہیں۔ کیونکہ کسی بھی پارلیمانی جمہوریت میں، اور خصوصاً پاکستان میں، عملاً یہی صورت حال ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ برطانیہ میں پارلیمنٹ نے بالاتری تو انتظامیہ (بادشاہ) کے مقابلے میں حاصل کی تھی، لیکن بالآخر وہ "بادشاہ" کے وزرا کے ماتحت ہوگئی ہے۔ جن کی اکثریت ہوتی ہے، وہی وزیر بنتے ہیں، پھر وہ وزیر اپنی اکثریت کے بل پر ہر قسم کے قانونی اور انتظامی فیصلوں اور اقدامات کے اختیار کے مالک ہوتے ہیں۔ اب جھگڑا مقننہ بمقابلہ انتظامیہ نہیں، انتظامیہ و مقننہ بمقابلہ عدلیہ و عوام ہے۔ بہرحال یہ ایک الگ دلچسپ بحث ہے۔ (برطانوی ہائی کورٹ کے جسٹس لاز (Laws) اسے "جمہوری استبداد" (democratic tyranny) سے تعبیر کرتے ہیں)۔

بہ غور دیکھا جائے تو پارلیمنٹ کی یہ مطلق بالاتری صرف ظاہری و قانونی ہے، حقیقی نہیں کہ استعمال ہو سکے۔ اختیار ہونے کے باوجود، کیا پارلیمنٹ دستور میں ترمیم کر کے اپنی مدت میں غیر معینہ توسیع کر سکتی ہے؟ کیا وہ بنیادی حقوق ختم کر سکتی ہے؟ کیا وہ صوبائی خود مختاری ختم کر کے وحدانی حکومت قائم کر سکتی ہے؟ کیا وہ عدلیہ کو ختم کر سکتی ہے؟ ظاہر ہے کہ وہ عملاً ان میں سے کوئی ترمیم نہیں کر سکتی۔ ہم آگے بڑھ کر پوچھتے ہیں کہ کیا وہ قرارداد مقاصد حذف کر سکتی ہے؟ کیا وہ اسلام کا مقام بہ حیثیت ریاست کے مذہب کے نکال سکتی ہے؟ کیا وہ اپنے اوپر سے یہ پابندی ختم کر سکتی ہے کہ قرآن و سنت کے خلاف قانون نہ بنائے؟ ظاہر ہے کہ نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ، خواہ دستور میں لکھا نہ ہو، مگر دستور کے کچھ حصے ناقابل ترمیم ہیں۔ پوری پارلیمنٹ متفقہ طور پر بھی قانون سازی کے ذریعے ان کو ختم نہیں کر سکتی۔ ان کو صرف کوئی انقلاب ہی ختم کر سکتا ہے، عوامی ہو یا فوجی۔ دیکھا جائے تو ان میں سے کسی سے اسلام ختم ہوتا ہے، کسی سے جمہوریت، کسی سے قیام عدل، کسی سے ملک کے باشندوں کا یہ حق کہ حکومت ان کی مرضی سے

آئے اور جائے 'کسی سے ان کے بنیادی حقوق 'اور کسی سے ملک کی وفاقی حیثیت۔

اس حقیقت کو بنیاد بناکر 'بھارت کی سپریم کورٹ ایک فیصلہ کر چکی ہے جو فی الواقع انقلابی نوعیت کا ہے۔اندرا گاندھی نے دستور میں ترمیم کی اور کچھ بنیادی حقوق حذف کر دیے۔ سپریم کورٹ نے پارلیمنٹ کی دو تہائی اکثریت سے منظور کردہ دستوری ترمیم کو اس بنیاد پر کالعدم کر دیا کہ یہ دستور کی بنیادیں ہیں اور ان میں ترمیم نہیں کی جا سکتی۔اس کے لیے کوئی نص خود دستور میں یا کہیں بھی موجود نہ تھی' صرف بانیان دستور کی نیت اور ارادے سے استدلال ممکن تھا۔ حکومت 'پارلیمنٹ' عوام سب نے اس فیصلے کو تسلیم کر لیا' حالانکہ یہ صریحاً دستور سے ماورا فیصلہ تھا۔ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ہماری سپریم کورٹ نے ججوں کے شریعت کورٹ میں تبادلے کے بارے میں ۲۰۳ سی کے نفاذ کو مسترد کرنے کے لیے بھارتی سپریم کورٹ کی طرح' اس مضبوط دلیل کو بنیاد کیوں نہ بنایا' کہ عدلیہ کی آزادی کسی بھی ترمیم سے ناقابل تنسیخ ہے' اور کیوں یہ کمزور استدلال اختیار کیا کہ کیوں کہ ۲۰۳ سی مارشل لا کی داخل کردہ ہے' اس لیے مرجوح ہے۔

ہمارے ہاں دستور پارلیمنٹ سے بالاتر قانون ہے' اگرچہ بظاہر اس کی دو تہائی اکثریت سے بالاتر نہیں 'مگر خود برطانیہ میں بھی' جہاں کوئی تحریری دستور نہیں' جہاں پارلیمنٹ (Queen in Parliament) فی الواقع مقتدر اعلیٰ ہے' اس کی قانون سازی پر کوئی پابندی نہیں' اور اس کے کسی قانون کو کالعدم نہیں قرار دیا جا سکتا' یہ اصول تسلیم کیا جاتا ہے کہ ایک قانون ایسا ضرور ہے جو پارلیمنٹ سے بھی مقدم اور بالاتر ہے۔ایسا نہ ہو تو خود پارلیمنٹ کے مطلق اختیار کی کوئی قانونی بنیاد نہیں رہ جاتی۔سالمند (Salmond) اپنی کتاب جیورس پروڈنس میں اسے ''حتمی قانونی اصول'' (ulitmate legal principle) کا نام دیتا ہے۔ سر ولیم ویڈ (Wade) کہتے ہیں کہ ''یہ ایسا اصول ہے جو اس لحاظ سے بنتا ہے کہ کوئی پارلیمنٹ اس کو بدل نہیں سکتی۔اس کی حفاظت عدالت کی تحویل میں ہوتی ہے' اور پارلیمنٹ کا کوئی ایکٹ یہ اختیار اس سے واپس نہیں لے سکتا''۔ (کیمبرج لا جرنل' ۱۹۵۵' ص ۱۷۲)۔ ہائی کورٹ کے جسٹس سر جان لاز (Laws) اس کو اعلیٰ تر قانون (higher-order law) کا نام دیتے ہیں' اور اس کی بالاتری کی بحث بڑے اہم انداز میں اٹھاتے ہیں: جمہوریت کی بقا اور نشوونما خود اس بات کی متقاضی ہے کہ جو سیاسی جمہوری اختیارات استعمال کرتے ہیں ان پر تحدید ہو' اور وہ اپنی حدود سے تجاوز نہ کریں... [اسی طرح] بنیادی حقوق کے تحفظ کا تقاضا ہے کہ ان کے لیے ایک بالاتر قانون ہو جسے دوسرے قوانین کی طرح صرف درکار اکثریت کے ذریعے منسوخ نہ کیا جا سکے۔ورنہ ان حقوق کی کوئی ضمانت نہیں۔پھر یہ حقوق نہیں' مراعات ہیں۔ اس لیے حاصل ہیں کہ حکومت دے رہی ہے' اس لیے نہیں کہ حق ہے۔ایک منتخب حکومت کو یہ

اختیار نہیں دیا جا سکتا کہ وہ دستور کی ان بنیادوں کو منہدم کر دے .... ہر مستبد حکمران یہی کہتا ہے کہ میرا ہر لفظ قانون ہے۔ اگر ایک منتخب ادارہ بھی یہی دعویٰ کرے کہ اس کا اختیار قانون سازی کسی تحدید یا نقد و نظر کا پابند نہیں' تو وہ مستبد کیوں نہیں۔ اس لیے لازم ہے کہ دستور کی بنیادیں حکومت کی تحویل میں نہ ہوں' کوئی حکومت اپنی اکثریت سے ان کو تباہ نہ کر سکے۔ وہ عدالت کی تحویل میں ہوں۔ اگر حکمرانی قانون کے مطابق ہونا ہے تو یہ ناگزیر ہے۔ (پبلک لا' ۱۹۹۵' ص ۸۱-۸۵)

خوش قسمتی سے ہمیں "دومبہم مطلق" چیزوں کی تلاش میں 'اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے پاس اللہ کی حاکمیت اعلیٰ اور قرآن و سنت کی صورت میں 'بالاترین اور ناقابل تغیر و تبدل قانون' لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمَاتِہٖ موجود ہیں۔ ہم نے ان کو اپنے دستور کا حصہ ضرور بنا لیا ہے مگر یہ دوسری دفعات کے مقابلے میں ناقابل ترمیم ہیں۔ "قرارداد مقاصد" اور "اسلام بحیثیت ریاست کا مذہب" جس کا منبع بھی قرارداد مقاصد ہی ہے' اسی دستوری حقیقت کے آئینہ دار ہیں۔ جب قوم نے تسلیم کر لیا کہ حاکم اللہ تعالیٰ ہے اور زندگی قرآن و سنت کے مطابق گزارنا ہے' تو ریاست کا مذہب اسلام ہو ہی گیا۔

یہ دونوں دفعات دستور کا حصہ بھی ہیں' اور دوسری دفعات سے بالاتر بھی۔ پھر دستور کے دوسرے حصے ہیں جو قرآن و سنت کی نصوص سے اجماعاً ثابت ہیں' اور جن پر پاکستان میں اجماع منعقد بھی ہو چکا ہے یعنی عدل کا قیام' یہ اسلام کے احکام میں سرفہرست اور سب سے مقدم ہے۔ ان اللہ یامر بالعدل و الاحسان۔ بنیادی حقوق' یہ سب نصوص سے ماخوذ ہیں' اللہ اور اس کے رسولؐ کے دیے ہوئے ہیں' کسی جدید کنونشن سے ماخوذ نہیں۔ جمہوریت' یعنی عوام کا یہ حق کہ امور مملکت ان کے مشورے اور مرضی سے چلائے جائیں اور حکمرانوں کا عزل و نصب ان کے اختیار میں ہو' یہ بھی نص قرآنی ہے اور چودہ سو سال سے امت میں متفق علیہ۔ ملک کی وفاقی حیثیت کا مدار براہ راست کسی نص پر نہیں' لیکن پاکستان ایک سماجی و سیاسی معاہدے کی بنیاد پر وجود میں آیا ہے۔ وفاق اس معاہدے کا جز ہے' اسی بنیاد پر صوبے اس میں شامل ہیں۔ اس معاہدے کی پابندی اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ اور وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اور اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ کے تحت لازم ہے۔ ان میں سے کسی چیز کو بھی کسی بھی جمہوری حکومت کو --- ۱۰۰ فی صد اکثریت سے بھی --- منسوخ کرنے کا اختیار نہیں ہے' اور نہ ہونا چاہیے۔

ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ دستور کی ان دفعات کی بالاتری کو سپریم کورٹ "آئین کی تشریح و تعبیر کے ذریعے دستور کا حصہ بنا دے۔ اب اس فیصلے میں ۲۰۹ کو ۲۰۳ سی سے بالاتر قرار دے کر' سپریم کورٹ نے اس اصول کو تسلیم کر لیا ہے کہ دستور کی ایک دفعہ دوسری دفعہ کو غیر موثر

کر سکتی ہے۔

اگر یہ اصول پہلے سے تسلیم کیا ہوا ہوتا' تو شریعت کورٹ میں تبادلے کے بارے میں ۲۰۳ سی کو اسلام میں قیام عدل کی نصوص سے ' قرارداد مقاصد میں عدلیہ کی آزادی کی ضمانت کی شق سے متصادم ہونے کی بنا پر بھی کالعدم قرار دیا جا سکتا تھا' اور کم سے کم شریعت کورٹ کے ججوں کی شرائط ملازمت تو واضح طور پر' ۲۰۳ سی کی طرح' ۲۰۹ سے متصادم ہیں۔ ان شرائط کے بارے میں کوئی درخواست دائر ہو تو اس کا فیصلہ اس فیصلے سے مختلف کیسے ہو سکتا ہے' جبکہ یہ نظیر ہی کا کام نہیں کرے گا' نافذ العمل بھی ہو گا۔

دوسرا اہم مبحث' انتظامیہ کے اختیارات کی حدود کا ہے۔ کہا گیا ہے کہ ججوں کے تقرر کے سلسلے میں مشورے کی یہ تعبیر ۔ کہ قابل قبول منفی وجوہات کی عدم موجودگی میں حکومت' چیف جسٹس کے مشورے پر عمل کی پابند ہے ۔ حکومت کے اختیار پر ایک خلاف دستور پابندی ہے۔ وجوہات بتانے کا مطالبہ' دفعہ ۴۸ (۲) کے خلاف ہے جو عدالت کو وزیراعظم کے مشورے کے بارے میں انکوائری سے روکتی ہے۔

"مشورے" کی تعبیر کے بارے میں فیصلے میں طویل اور مضبوط دلائل دیے گئے ہیں۔ اس موضوع پر کسی مزید گفتگو کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس کی تعریف معاملے کی نوعیت پر منحصر ہو گی جو متعین کرنے کا اختیار صرف سپریم کورٹ ہی کو ہے۔ ظاہر ہے کہ چیف جسٹس کا مشورہ ردی کی ٹوکری میں پھینک دینے کے لیے دستور میں درج نہیں کیا گیا۔ اس کا مقصد اہل افراد کا تقرر یقینی بنانا ہے۔ اسی مقصد کے لیے سپریم کورٹ نے وہ تعبیر ضروری سمجھی ہے جو فیصلے میں درج ہے۔ لیکن اس مسئلے پر قیام عدل کے وسیع پس منظر میں غور و فکر ضروری ہے' اس لیے کہ یہ حکمرانوں کے اختیارات کے استعمال کو عدل پر قائم رکھنے کے مسئلے کا ایک حصہ ہے۔

قیام عدل' قانون کے سامنے مساوات اور قانون کے یکساں تحفظ کے مقاصد صرف مجرموں کو سزائیں دینے سے حاصل نہیں ہوتے۔ قیام عدل' قانون کی حکومت قائم کرنے کا نام ہے' تاکہ کوئی کسی کا حق نہ مار سکے' خصوصاً کوئی طاقت ور کسی کمزور کے ساتھ زیادتی یا ناانصافی نہ کر سکے۔ کیونکہ اصل طاقت ور وہ ہیں جن کے پاس حکومت کی قوت ہوتی ہے' اس لیے قیام عدل کے معنی' خصوصاً اس امر کو یقینی بنانا ہے کہ کوئی حکومتی یا پبلک عہدے دار یا ادارہ ۔ چھوٹا ہو یا بڑا' منتخب ہو یا غیر منتخب' صدر ہو یا وزیراعظم' فوجی جنرل ہو یا سول سیکرٹری' تھانے دار ہو یا پٹواری' جو لوگوں کے ساتھ کوئی بھی معاملہ کرنے کے لیے کسی بھی اختیار اور طاقت کا حامل ہے' وہ ۔۔ قانون اور اپنی حدود سے

تجاوز نہ کرنے پائے 'نہ کسی کے ساتھ بے انصافی اور ظلم کا مرتکب ہو' نہ کسی کا حق مارے ۔ اس مقصد کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ تمام حکومتی اہل کار اور ادارے 'اپنے فیصلوں اور اقدامات کے لیے عدالتوں کے سامنے جواب دہ ہوں۔

قرآن و سنت میں ظلم اور عدل کے بارے میں بے شمار نصوص میں 'اس قیام عدل سے التزام کی شدت کے ساتھ تاکید موجود ہے ۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید کی ساتھ ساتھ 'اپنے قائم بالعدل ہونے پر خود اپنی' فرشتوں کی اور تمام اہل علم کی گواہی دی ہے (آل عمران ۲: ۱۸)۔ مولانا اصلاحی کے الفاظ میں ''عدل و قسط کا درجہ صفات الٰہی میں اتنا بلند و ارفع ہے کہ توحید کے بعد سب سے پہلے جس کا ذکر ہو سکتا ہے وہ یہی ہے کہ اللہ قائم بِالقِسطِ ہے ۔ ''قسط کا مفہوم وہی ہے جو ہم عام بول چال میں حق 'عدل اور انصاف وغیرہ کے الفاظ سے ادا کرتے ہیں ۔ اس کا ضد ظلم 'جور اور اس معنی کے دوسرے الفاظ ہیں''۔ انسان کی فطرت گواہ ہے کہ خالق نے انسان کو عدل پسند بنایا ہے 'تاریخ گواہ ہے کہ وہ دنیا کو ''ایک نظام عدل و قسط کے تحت چلا رہا ہے''۔ کائنات گواہ ہے کہ اس کے ہر گوشے میں خالق نے ''ایک میزان رکھی ہے''۔ اور وہ خود ''عدل و قسط کو پسند کرتا ہے 'یہ نہیں چاہتا کہ اس کی مخلوقات میں سے کوئی چیز اس عدل و قسط سے بال برابر انحراف کرے''۔ چنانچہ وہ کہتا ہے ''دیکھو میزان کے معاملے میں تجاوز نہ کرو۔ بلکہ انصاف کے ساتھ وزن قائم کرو۔ اور نہ میزان میں کوئی کمی کرو''۔ (الرحمن ۵۵: ۸۔۹)

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول بھیجنے اور کتاب و میزان اتارنے کی غایت بھی یہی بیان فرمائی ہے: ''تاکہ لوگ قسط پر قائم ہو جائیں'' (الحدید ۵۷:۲۵)۔ امت کا مقصد بھی اس نے یہی متعین کیا ہے: ''اللہ کے لیے 'قسط کو قائم کرنے والے اور قسط پر گواہ بنو'' (النساء ۴:۱۳۵' المائدہ ۵: ۸)

اسی قیام عدل کے لیے اس نے اپنے اوپر بھی ظلم کو حرام کیا ہے 'اور بندوں کے مابین بھی ۔ پھر اس نے قیام عدل کے لیے انسانیت کے واسطے پوری امت پر سے 'مجموعی طور پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری عائد کی ہے ۔ سب سے بڑا معروف 'توحید کے بعد عدل ہی ہے 'اور سب سے بڑا منکر 'شرک کے بعد ظلم ۔ پھر مسلمانوں کے درمیان یہ ذمہ داری تمام مسلمان مردوں اور عورتوں پر ڈالی ہے ' وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَامُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۔ ایک گروہ کا لازماً موجود رہنا جو یہ کام کرے ضروری قرار دیا ہے ' وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ ۔۔۔ الخ ۔ سیاسی اختیار ملے تو اولین فرائض میں اس کو شامل کیا ہے ' اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۔ لوگوں کے درمیان تمام فیصلہ کرنے والوں کو حکم دیا

کہ عدل کے ساتھ فیصلہ کرو۔ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ (النساء ۴: ۵۸) اور فیصلہ کرو تو ٹھیک انصاف کے ساتھ کرو، وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ (المائدہ ۵: ۴۲)۔ تفصیل کا وقت نہیں، لیکن نبی کریمؐ سے لے کر بڑے بڑے دنیا دار اور مطلق العنان بادشاہوں تک اگر ہماری تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے کہ حکمران عام آدمیوں کی طرح عدالتوں کے سامنے جواب دہ ہوتے تھے، تو یہ قرآن اور رسول اللہؐ کی انھی تعلیمات کی وجہ سے ممکن ہوا۔ ریاست اور دستور کے لیے چارٹر وہ ہے جو خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ نے خلافت سنبھالنے کے بعد، اپنے افتتاحی خطاب میں پیش کیا: ”میں ایک انسان ہی ہوں، صحیح بات بھی کرتا ہوں اور غلط بھی۔ اگر میں صحیح کام کروں تو میری مدد کرنا، اگر میں غلط کام کروں تو مجھے ٹھیک کر دینا.... دیکھو، تم میں سب سے زیادہ طاقت ور میرے نزدیک سب سے کمزور ہے یہاں تک کہ میں اس سے حق وصول کر لوں، اور تم میں سب سے کمزور میرے نزدیک سب سے طاقت ور ہے، یہاں تک کہ میں اس کے لیے اس کا حق وصول کر لوں“۔ یہی کلمات حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمائے۔ اسی لیے وہ اپنے گورنروں کا خود احتساب کرتے تھے، ان کو سزائیں بھی دیتے تھے اور ان سے حق اور قصاص بھی دلواتے تھے۔ اگر کسی گورنر نے کسی کو غلط کوڑے مارے ہوتے تھے تو مدعی کے ہاتھ میں کوڑا تھما دیتے کہ گورنر کو مارو۔

بدقسمتی سے ہمارا دستور یا ہمارا کوئی قانون اسلام کے ان احکام اور روایات کا پوری طرح حامل نہیں ہے۔ بلکہ الٹے، دستور میں ان احکام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ۲۴۸ کے تحت تمام منتخب حکمرانوں کو اپنی حکومتی اختیارات کے استعمال یا فرائض کی بجا آوری کے سلسلے میں ہر قسم کی عدالتی جواب دہی سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر، دوران عہدہ ہر قسم کی عدالتی کارروائی سے بھی۔

ہاں، حکمرانوں کو خلاف قانون کاموں سے روکنے اور قانون کے مطابق اقدامات کرنے کے لیے، درخواست دیے جانے پر، پروانے اور احکام جاری کرنے کے اختیارات دفعہ ۱۹۹ کے تحت، ہائی کورٹ کو دیے گئے ہیں، اور بنیادی حقوق کی خلاف ورزی کی صورت میں سپریم کورٹ کو از خود بھی احکام جاری کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ یہ اختیارات ایک درجے میں اسلام کے بنیادی احکام کا تقاضا پورا کرتے ہیں اور حکومتی اہل کاروں اور اداروں کے فیصلوں کے عدالتی نقد و نظر کا دروازہ کھولتے ہیں، لیکن مختلف عوامل کی وجہ سے یہ نقد و نظر برائے نام ہی ہو رہا ہے: یہ عوامل، عوام کی غربت و جہالت، انصاف کی گرانی، حکومتی اہل کاروں کی طاقت، اور خود عدلیہ کی سرد مہری اور محتاط روش، ہیں۔ خصوصاً جج حضرات قانون کی خلاف ورزی کی تعریف میں قانونی اختیارات کی لفظی تعبیر سے تجاوز سے آگے جانے کو عموماً تیار نہیں، اور انتظامیہ بھی اس سے زیادہ کچھ دینے کے لیے تیار نہیں۔

لیکن یہ بات اب ہمارے ہاں متعدد مقدمات میں آچکی ہے کہ حکمرانوں کے فیصلوں کے سلسلے میں عدالت قانونی الفاظ سے آگے بڑھ کر' بدنیتی یا طریق کار کی بے انصافیوں یا فطری انصاف کے اصولوں کی خلاف ورزی کا کھوج بھی لگا سکتی ہے۔ جونیجو اسمبلی کی برطرفی کے بعد' یہ بات بھی طے ہوگئی کہ صدر کے خالص صوابدیدی اختیارات کے استعمال کو' نامعقولیت اور مبنی بر انصاف نہ ہونے کی بنیاد پر بھی عدالت کالعدم قرار دے سکتی ہے۔ نواز شریف کیس میں ایک محترم جج یہ بھی لکھ چکے ہیں کہ چیف آف سٹاف کا تقرر بھی عدالت کے دائرہ اختیار سے باہر نہیں۔ انہی روایات اور فیصلوں کی روشنی میں' سپریم کورٹ کا یہ فیصلہ کہ --- اس کی سفارش قبول نہ کیے جانے کی صورت میں اسے وجوہات بتائی جائیں' اور معقول منفی وجوہات نہ ہوں تو مشورہ قبول کیا جانا چاہیے --- کسی طرح بھی انتظامیہ کے اختیار میں مداخلت نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ ہم تو یہ کہیں گے کہ صدر یا حکومت کے جس حکم سے دستور کے بنیادی مقاصد مجروح ہوتے ہیں یا جس کو جاری کرنے میں قانون' انصاف یا معقولیت کے تقاضے مجروح ہوتے ہوں' عدالتیں اس کا جائزہ لے سکتی ہیں اور اس کو صحیح کر سکتی ہیں۔

منتخب حکمرانوں کا عدالتی جواب دہی سے استثنا تو اسی وقت ختم ہو سکتا ہے جب دفعہ ۲۴۸ کو دفعہ ۲ اور ۲۔اے کے متناقض قرار دے کر اس پر عمل درآمد ختم کر دیا جائے۔ لیکن ایسا نہ بھی ہو تو قرارداد مقاصد' مذہب اسلام اور قیام عدل کے جو تقاضے ہیں' اب تک ہماری عدالتیں جو نظائر قائم کر چکی ہیں' انگلستان اور ہندوستان کی عدالتوں نے جو عدالتی فعالیت اختیار کی ہے اور کر رہی ہیں' ان کو سامنے رکھ کر ہماری عدالتیں کچھ سرگرمی دکھائیں تو ان کے لیے حکومت پر قانون کی حکومت قائم کرنے کے لیے بڑا میدان موجود ہے۔

بھارت میں عدالتوں کو اتنے ہی اختیارات ہیں جتنے ہمارے ہاں ہیں اور وہ بہت کچھ کر رہی ہیں۔ انگلستان میں عدالتوں کو ایسے کوئی اختیارات حاصل نہیں' کوئی ایکٹ آف پارلیمنٹ نہیں جو انھیں پبلک اہل کاروں اور اداروں کے فیصلوں اور اقدامات کے بارے میں عدالتی کارروائی کا اختیار دیتا ہو' لیکن گذشتہ ۳۰ سال میں' عدالتوں نے جوڈیشیل ریویو (عدالتی جائزہ یا نقد و نظر) کے نام پر اتنے اختیارات حاصل کر لیے ہیں اور پبلک لا کے نام سے اتنا وسیع قانونی نظام وضع کر لیا ہے کہ حیرت انگیز ہے۔ جہاں ساورن صرف پارلیمنٹ ہے' وہاں' ہائی کورٹ کے جج' سر اسٹیفن لیڈے لکھتے ہیں:

"گذشتہ تیس سال کی عدالتی نقشہ گری کا نتیجہ یہ ہے کہ اب وہ "پارلیمنٹ" ختم ہو رہی ہے جس کے سامنے قانون کی حکومت بھی جھک جاتی تھی۔ اب دو محوری ساورنٹی ہے: ایک "تاج"' بذریعہ پارلیمنٹ کی' اور دوسری "تاج" بذریعہ عدالت کی۔ "تاج" کے وزرا دونوں کے سامنے جواب دہ ہیں: سیاسی طور پر پارلیمنٹ کے سامنے' قانونی طور پر عدالت کے سامنے" (پبلک لا'

۱۹۹۵، ص ۳۸۹)۔ یہ نتیجہ ہے اس نظریے کا کہ "عدل' قانون پر مقدم ہے' اور قانون کا بنیادی فریضہ طاقت ور کے مقابلے میں کمزور کا تحفظ ہے"۔ یہ تصور کہ حقوق انسانی اور قانون کی حکمرانی کا بنیادی فریضہ طاقت ور کے مقابلے میں کمزور کی حفاظت کرنا ہے' نری جذباتیت ہیں۔ یہ قانون کی نظروں میں سب کی یکسانیت اور مساوات کی پیداوار ہے" (ایضاً' ص ۳۹۷-۳۹۹)۔

سوچنا چاہیے کہ ہماری سپریم کورٹ' ازخود (سوموٹو) بنیادی حقوق کے تحفظ کے اختیار کو استعمال کرے' تو "قانون کی نظروں میں سب کی برابری" کے حق کے تحت کیا کچھ نہیں کر سکتی۔

دوسرے جج' سرجان لاز مزید وضاحت کرتے ہیں: "جوڈیشل ریویو کے لیے ہم ججوں کا دائرہ اختیار اب اتنا وسیع ہے کہ ہم اصولاً ہر پبلک باڈی (فرد یا ادارے) کے ہر فیصلے کی عدالتی نگرانی کر سکتے ہیں۔ اس سے کوئی فی الواقع مستثنیٰ ہے تو وہ پارلیمنٹ کا پاس کردہ قانون..... یہ استثنا بھی اب یوروپین یونین کے قانون کا پابند ہے.... "شاہی اختیار (Royal Prerogative) کے استعمال کو بھی [جو ہمارے ہاں صدر کے صوابدیدی سے بڑا اختیار ہے] اب ڈویژنل کورٹ کی سطح پر عدالتی دائرہ اختیار میں شامل کر لیا گیا ہے"۔ (پبلک لا' ۱۹۹۵' ص ۷۵)۔ وہ کہتے ہیں: جوڈیشل ریویو کے اصول اس تصور پر مبنی ہیں کہ ریاستی حکام کا کردار اخلاقی طور پر نیک اور بھلا ہونا چاہیے۔ چنانچہ صرف یہی نہیں دیکھا جاتا کہ ان کے فیصلے قانون کے الفاظ کے مطابق ہیں یا نہیں' بلکہ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ معقول ہیں یا نہیں' اختیارات کا استعمال منصفانہ ہے یا نہیں' جو طریق کار اختیار کیا گیا وہ منصفانہ ہے یا نہیں۔ قانونی اختیار کو بھی اتنا وسیع نہیں لیا جاتا جتنا الفاظ بتاتے ہوں۔ یہ سب اصول ججوں کے بنائے ہوئے ہیں' کسی پارلیمنٹ نے نہیں بنائے۔ ان کو قبولیت عام حاصل ہے۔ ان سے حکومت یا کسی منتخب ادارے کو اپنے اختیارات میں مداخلت محسوس نہیں ہوتی۔ (ایضاً' ص ۷۸ تا ۸۱)

ہم نے یہ تفصیل اس لیے بیان کی کہ' اسلام کے احکام کو تو جانے دیجیے' ہمارے ہاں تو صرف مشورے کو بامقصد اور کارگر بنانے پر یہ شور و غوغا ہے۔ ایک جدید سیکولر ریاست میں تو وزیر بھی عدالت کے سامنے جواب دہ بنائے جا رہے ہیں' اور دیگر حکام بھی۔ اور ان کے احکام کو صرف لفظ قانون نہیں' بلکہ روح قانون اور مقصد قانون' قیام عدل اور طاقت ور کے خلاف کمزور کے تحفظ کے اصولوں پر جانچ کر ان کو حدود کا پابند کیا جا رہا ہے۔ پھر یہ کام ہمارے ہاں کیوں نہ ہو جب کہ یہ اسلام کا عین تقاضا ہے اور ریاست فرد کی طرح اسلام کی پابند ہے کہ اس کا مذہب اسلام ہے۔

تیسرا اہم مبحث دفعہ ۲۰۹ کو ۲۰۳ سی پر فائق و راجح قرار دینے کا ہے۔ دونوں متضاد ہیں' یہ تو بالکل واضح ہے۔ ۲۰۹ کے تحت ایک جج کو یہ تحفظ حاصل ہے کہ اس کو اس کے عہدے سے صرف

سپریم جوڈیشل کونسل ہی ہٹا سکتی ہے' ۲۰۳ سی کے تحت حکومت' ایک ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کا شریعت کورٹ میں تبادلہ کر سکتی ہے' جس سے اس کی شرائط ملازمت اتنی غیر محفوظ ہو جاتی ہیں کہ حکومت اس کو چپڑاسی بھی لگا سکتی ہے۔ یہ تضاد ترمیم کرنے والوں کا قصور ہے۔ عدالت کو تو یہ تضاد رفع کرنا ہی تھا' اور اس نے بالکل صحیح کیا کہ ۲۰۹ کو ۲۰۳ سی پر فائق کیا۔ لیکن ہم ادب سے عرض کریں گے کہ اس مقصد کے لیے اس نے جو استدلال کیا وہ بہت کمزور اور متناقض ہے' یعنی یہ کہ دفعہ ۲۰۹ بانیان دستور نے بنائی تھی' ۲۰۳ سی مارشل لا نے۔ کیا اگر ۲۰۳ سی جیسی دفعہ دو تہائی اکثریت سے پاس ہوتی تو اسے غیر موثر نہ قرار دیا جاتا۔ اگر بانیان دستور ہی نے دو دفعات ایسی رکھی ہوں جو باہم متصادم ہوں' اور ان میں سے ایک مقصد دستور کی حیثیت رکھتی ہو' تو پھر کورٹ کیا کرے گی۔ مثلاً ہماری نظر میں دفعہ ۲۴۸ اور دفعہ ۴۵ (صدر کا رحم کا اختیار) دونوں دفعہ ۲ اور ۲۔اے سے متصادم ہیں۔ (قتل کی سزا کے لیے دفعہ ۴۵ کا یہ تناقض تو لاہور ہائی کورٹ بھی تسلیم کر چکی ہے)۔

ہمارے خیال میں اس مقصد کے لیے ایک ہی مضبوط دلیل ہو سکتی تھی وہ یہ کہ چونکہ ۲۰۳ سی' عدلیہ کی آزادی کے منافی ہے' اس لیے وہ دفعہ ۲۔اے سے متصادم ہے' چنانچہ اس پر عمل در آمد نہیں کیا جانا چاہیے کیونکہ ۲۔الف کو اور آزادی عدلیہ کو تفوق حاصل ہے' یہ دستور کے ناقابل ترمیم حصے ہیں۔ مارشل لا ہو یا پارلیمنٹ کوئی بھی ان میں ترمیم نہیں کر سکتا' نہ دستور میں ایسی ترمیم جو ان سے متناقض ہو۔ لیکن شاید سپریم کورٹ کورٹ نے یہ استدلال اسی لیے اختیار نہیں کیا کہ وہ اس سے قبل قرار داد مقاصد کی فوقیت کے بارے میں لاہور ہائی کورٹ کے فیصلے کو مسترد کر کے یہ قرار دے چکی تھی کہ سب دفعات برابر ہیں۔ حالیہ فیصلے کے نتیجے میں بھی اصولاً تو یہی نکلتا ہے کہ سب دفعات برابر نہیں ہیں' خواہ اس بنیاد پر کہ ایک بانیان نے ڈالی ہے اور دوسری مارشل لا نے' یا اس بنیاد پر کہ ایک ناقابل ترمیم بنیادی حصے سے متعلق ہے' دوسری اس حصے کے منافی ترمیم کر رہی ہے۔

یہ تو محترم جج ہی بتا سکتے ہیں کہ انھوں نے دوسری تعبیر کیوں اختیار نہیں کی' جبکہ ایسی تعبیر بھارت کی سپریم کورٹ بھی اختیار کر چکی ہے۔ لیکن اب جب کہ ہماری سپریم کورٹ کم سے کم یہ اصول تسلیم کر چکی ہے کہ دو دفعات متصادم ہوں تو دو میں سے ایک کو فوقیت دینا جائز ہے' تو وقت آگیا ہے کہ وہ جرات کر کے اپنے سابقہ فیصلے پر نظر ثانی کرے اور قرار داد مقاصد (۲۔اے) کو دستور کا بالاترین' بنیادی' ناقابل ترمیم حصہ قرار دے' اور دستور کی جو دفعہ یا قانون اس سے متصادم ہو اس پر عمل در آمد کو غیر موثر کر دے۔ پھر ۲' اے سے استدلال کر کے' جب اور جیسا موقع آئے' وہ اسلام کے مقام' بنیادی حقوق' جمہوری اصول اور عدلیہ کی آزادی کو بھی یہی مقام دے کہ یہ چیزیں ناقابل ترمیم ہیں۔

ایسا کیے بغیر اس ملک میں کبھی قانون کی حکومت اور عدل کا قیام عمل میں نہیں آئے گا۔ اس کے بغیر ان الجھنوں سے ہرگز نجات نہیں ملے گی جن میں آج پورا ملک اور عدالتیں پھنسی ہوئی ہیں۔ اسی اقدام سے ایک ترقی پذیر، پرامن، عادلانہ اور فلاحی، اسلامی معاشرے کی تعمیر ممکن ہوگی۔ اس کے بعد اگر صرف قرار داد مقاصد (۲-الف) اور "اسلام ریاست کا مذہب" کی بنیاد پر عدالتیں آگے بڑھیں گی، اور تدریج اور حکمت کو ملحوظ رکھیں گی، تو وہ طاقت ور حکمرانوں کی تمام بے راہ رویوں کو لگام دے سکیں گی، اور زندگی کے ہر دائرے میں لوگوں کو انصاف فراہم کر سکیں گی۔ ان کے سامنے ایسے ایسے نظائر ہوں گے کہ ان کے قانونی اثرات کا اندازہ بھی ممکن نہیں مثلاً یہ کہ حضورؐ نے ایک سرکاری اہل کار کا تمام زائد مال ضبط کر لیا تھا، حضرت عمرؓ گورنروں کے طرز رہایش اور مال و اسباب تک کا جائزہ لیتے تھے، حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا تھا کہ اگر میں اللہ کی نافرمانی کروں تو میرا کہنا نہ ماننا، حضرت عمرؓ نے کہا تھا کہ دجلہ و فرات کی وادی میں ایک بکری بھی بھوکی مرجائے گی تو مجھ سے جواب طلب کیا جائے گا، یا یہ کہ اسلام میں کوئی آدمی عدل کے تقاضے پورے کیے بغیر جیل میں نہ ڈالا جائے گا۔

فیڈرل شریعت کورٹ کے سابق چیف جسٹس گل محمد صاحب مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ اگر کوئی دوسرا قانون نہ ہو، اور جج اسلام کو نافذ کرنا چاہیں تو ان کے لیے یہی ایک دفعہ کافی ہے کہ "ریاست کا مذہب اسلام ہے"۔ اس کے صاف اور سیدھے معنی یہ ہیں کہ ریاست کو اسلام کی ساری ہدایات پر عمل کرنا چاہیے۔ یہ دیکھا جائے کہ برطانیہ میں، ۳۰ سال میں جج صاحبان نے پبلک لا کو کیا سے کیا بنا دیا ہے، تو ان کی اس بات کی صداقت میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا۔

ہم ملک کے سارے ہی خواہوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اس فیصلے کی حمایت میں بھی، اور آگے کے مراحل کے لیے بھی آگے آئیں اور رائے عامہ کو عدالتوں کی پشت پناہی کے لیے تیار کریں۔ رائے عامہ کی پشت پناہی کے بغیر، اس فیصلے کا باقی و برقرار رہنا بھی مشکل ہو سکتا ہے، کجا یہ کہ آگے پیش رفت ہو، اور پورے دستور ہی کو لپیٹ دینے کے منصوبے بھی دفن نہیں کر دیے گئے ہیں۔

خاص طور پر ہم دین کے علم بردار عناصر سے اپیل کریں گے کہ وہ اس مقصد کے لیے آگے آئیں۔ ہمارا احساس ہے کہ ۱۹۷۷ کے بعد سے ان عناصر نے حکمرانوں کو قانون کا پابند بنانے کے لیے کوئی آئینی و قانونی جدوجہد نہیں کی، ورنہ مارشل لا، نظریہ ضرورت، پی سی او، عدلیہ پر شب خون، غیر جماعتی انتخابات، تینوں وزرائے اعظم اور اسمبلیوں کی برخاستگی، ججوں کے شریعت کورٹ میں تبادلے --- ان سب کے خلاف سیاسی مہم میں ان کو پیش پیش ہونا چاہیے تھا۔

ہم اللہ تعالیٰ سے بھی دعا کرتے ہیں کہ وہ ملک کے راہ نماؤں کو عدل و انصاف کی راہ دکھائے، عدل و انصاف پر قائم رکھے اور عدل و انصاف کے ساتھ ملک کو چلانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

زندہ ایمان

سبزی منڈی یا فروٹ منڈی میں
یا سبزی اور پھل کی دکان پر
- چند لمحات رک کر سوچیے!

زمین کے پیٹ سے جیسے کسی نہ ختم ہونے والے خزانے سے
کن کن شکلوں کے، رنگوں کے، ذائقوں کے خواص کے،
پروڈکٹس نکلے چلے آ رہے ہیں۔

اگر آپ جانتے نہ ہوں، آپ نے دیکھا نہ ہو، کوئی بتائے تو
کیا آپ اسے سچ مان لیں گے؟

ان سائنسی حقائق سے زیادہ خلاف عقل بات شاید کوئی نہ لگے!

دوستو! جب آخرت واقع ہو جائے گی
تو اس سے بڑی سائنسی حقیقت کوئی نہ ہوگی

بات تو جب ہے کہ سچے آدمیؐ کی بات ابھی مانو:
وہ دن آئے گا جب ہاتھ پاؤں بولیں گے گواہی دیں گے

اے اللہ کے بندو! تمھیں کیا ہوگیا ہے؟
اپنے مردہ، بے جان ایمانوں کو جھٹک دو
اللہ پر زندہ، جیتا جاگتا، بڑھنے والا ایمان لاؤ

کلامِ نبویؐ کی صحبت میں

خرم مراد

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی،
فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ (الانعام ۶: ۱۲۵)
جس کو اللہ ہدایت دینے کا فیصلہ کرتا ہے، اس کے سینے کو اسلام کے لیے کھول دیتا ہے۔

یہ آیت پڑھنے کے بعد رسول اللہؐ نے فرمایا: بے شک جب نور سینے میں داخل ہو جاتا ہے، تو سینہ کھل جاتا ہے۔

لوگوں نے پوچھا: اے اللہ کے رسولؐ، کیا اس (نور اور شرح صدر) کی کوئی علامت بھی ہے جس سے اسے پہچانا جا سکے۔

فرمایا: ہاں، آدمی کا دل اس دنیا سے بے نیاز اور اچاٹ ہو (جو لبھاتی ہے، مگر ختم ہونے والی ہے)،

وہ اس گھر کی طرف متوجہ اور اس کے لیے مشتاق ہو جو ہمیشہ باقی رہنے والا ہے،

اور موت کے آنے سے پہلے وہ موت کی تیاری میں لگ جائے۔ (بیہقی، بحوالہ مشکوٰۃ کتاب الرقاق)

ہدایت اللہ کے دینے ہی سے ملتی ہے، لیکن وہ یہ ہدایت ایک ضابطہ کے مطابق دیتا ہے، اور ایک طریقہ کے مطابق دیتا ہے۔ دنیا کے رزق کی طرح بغیر حساب نہیں دیتا۔

اولیں اصول یہ ہے کہ آدمی کے دل میں ہدایت کے لیے طلب ہو، اور وہ اللہ کی طرف رجوع کرے۔
يَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ

ہدایت کا آغاز آدمی کے دل اور باطن سے ہوتا ہے، اس کی بقا کا انحصار بھی اس کے باطن اور دل پر ہوتا ہے۔

ہدایت کا ماحاصل یہ ہے: کسی وقت بھی ختم ہو جانے والی دنیا کو مقصود نہ بنانا، اس سے بے رغبت اور

بے نیاز ہو جانا' اور آخرت کی ہمیشہ باقی رہنے والی زندگی کے حصول کے لیے یک سو ہو جانا' اسی کی فکر اور اس کے لیے تگ و دو میں لگ جانا' دنیا کے ہر کام اور دل چسپی کو اس کے تابع کر دینا۔

آخرت کے ارادے اور اس کے لیے سعی سے ہی دل میں نور داخل ہوتا ہے' اور جہاں تک نور پھیلتا ہے' اس کے دل کی تاریکی اور تنگی دور ہوتی جاتی ہے' اور اتنی ہی اس کی فطری وسعت زیادہ روشن اور کشادہ ہوتی جاتی ہے۔ اسی تناسب سے اس کی ہدایت کی راہ چلنے کی استعداد بڑھ جاتی ہے۔ یہاں تک کہ دل اس جنت کی طرح ہو جاتا ہے جس کی وسعت میں زمین و آسمان سما جائیں۔

○

حضرت عبدالرحمٰن بن ابی قرادؓ بیان کرتے ہیں:

ایک دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو فرمایا: حضورؐ کے کچھ اصحاب آپؐ کے وضو کا پانی لے کر اپنے چہروں پر ملنے لگے۔

آپؐ نے پوچھا: کیا جذبہ ہے جو تم سے یہ کروا رہا ہے؟

لوگوں نے کہا: اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کو اس بات سے خوشی ہوتی ہو کہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت کرے' اور اللہ اور اس کے رسولؐ اس سے محبت کریں' اسے چاہیے کہ:

جب بات کرے' سچ بولے'

جب کوئی امانت سپرد کی جائے' اس کو امانت داری کے ساتھ ادا کر دے'

اور اپنے پڑوسیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔ (بیہقی' بحوالہ مشکوٰۃ' باب البر والصلہ)

محبت اور حصول برکت کے ظاہری مظاہر سے بھی روکا نہیں گیا: حضورؐ کے وضو کا پانی چہروں پر ملنا' آپؐ کے بالوں کا تبرک کے طور پر رکھنا' آپؐ کی چادر تکفین کے لیے حاصل کرنا' آپؐ کا بچا کھچا کھانا' آپؐ کے قدم مبارک اپنے چہرے پر رکھنا۔ یہ مظاہر اہم ہیں۔

محبت کی حقیقت بھی واضح کر دی' کہ ان مظاہر میں کھو نہ جائیں' انھی کو کافی نہ سمجھ لیں۔ وہ ہے سچائی' امانت داری اور انسانوں کے ساتھ حسن سلوک۔

سچائی' تمام نیکیوں کی کلید ہے۔

امانت داری' ایمان کی روح و حقیقت ہے۔ امانت میں ہر چیز شامل ہے: مال' انسان' اہل و عیال' اپنی ذمہ داریاں۔

پڑوسی ہر طرح کے' رشتہ دار ہوں یا اجنبی' مسلمان ہوں یا غیر مسلم' مستقل ساتھ رہنے والے یا عارضی' یہاں تک کہ چند لمحات کے لیے ساتھ بیٹھنے اور ساتھ کام کرنے والے بھی۔

○

حضرت ابوخزامہؓ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا:

میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: اے اللہ کے رسولؐ یہ دعا، تعویذ جو ہم اپنی بیماریوں کے لیے کرتے ہیں، اور یہ دوائیں جو ہم علاج کے لیے استعمال کرتے ہیں، اور یہ حفاظتی تدابیر جو ہم مصیبتوں اور پریشانیوں سے بچنے کے لیے اختیار کرتے ہیں، کیا ان سے اللہ کی تقدیر کو ٹالا جا سکتا ہے؟

حضورؐ نے فرمایا: یہ سب چیزیں بھی تو اللہ کی تقدیر ہی کا حصہ ہیں۔ (ترمذی، احمد، بحوالہ مشکوٰۃ، باب الایمان بالقدر)

تقدیر اور تدبیر کے بارے میں سارے وسوسوں اور شبہات کا اصل سبب ایک ہے:
اللہ تعالیٰ کو مالک کُل، ہر امر کی تدبیر کا وحدہ لاشریک مالک نہ سمجھنا۔
صرف تعبیر کا فرق ہے، ورنہ بندہ کی کوئی تدبیر بھی اللہ کے اذن اور اس کی قدر کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ بات سمجھ میں آجائے تو سارے شبہات دور ہو جاتے ہیں۔

○

حضرت زیاد بن لبید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:
ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خوف ناک چیز کا ذکر کیا، اور پھر فرمایا:
"ایسا اس وقت ہو گا جب علم رخصت ہو جائے گا"۔
میں نے کہا: اے اللہ کے رسول، علم کیوں کر رخصت ہو جائے گا؟ جب کہ ہم قرآن پڑھ رہے ہیں، اور اپنی اولاد کو پڑھا رہے ہیں، اور ہماری اولاد اپنی اولاد کو پڑھاتی رہے گی؟
حضورؐ نے فرمایا: خوب، اے زیاد، میں تو تمھیں مدینہ کا بہت سمجھ دار آدمی سمجھتا تھا! ان یہود و نصاریٰ کو دیکھو! یہ تورات و انجیل کی کتنی تلاوت کرتے رہتے ہیں، لیکن اس کی کسی بات پر بھی عمل نہیں کرتے۔

قرآن، اول تا آخر، دعوتِ عمل ہے، انسان کو بدلنا اس کا مقصد ہے۔
قرآن کے علم کی حقیقت عمل ہے۔ عمل نہ ہو تو تفسیر کی موٹی موٹی کتابوں اور طویل طویل دروس قرآن کے باوجود "علم" مفقود ہے۔

○

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس طرح بھیڑیا بکریوں کا دشمن ہوتا ہے، اور جو بکری اپنے گلہ سے الگ ہو کر اکیلی رہ جاتی ہے، اسے وہ بہ آسانی شکار کر لیتا ہے، اسی طرح شیطان، انسان کے لیے بھیڑیا ہے۔ جو جماعت میں نہ ہوں، یہ ان کو الگ الگ کر کے نہایت آسانی سے شکار کر لیتا ہے۔
تو اے لوگو، پگ ڈنڈیوں پر نہ چل پڑنا بلکہ جماعت اور عامۃ المسلمین کے ساتھ رہنا۔ (احمد،

بحوالہ مشکوۃ)

اجتماعیت کا حصار ' فرد کے دین کی حفاظت کے لیے لازمی ہے ۔گھر اور خاندان کی اجتماعیت ' شادی شدہ زندگی کی اجتماعیت ' مسجد کی اجتماعیت ' غرض ہر جگہ اس اجتماعیت کا قلعہ فراہم کیا گیا ہے ۔

تنہا آدمی وساوس و خیالات کا شکار بہ آسانی ہوتا ہے ۔

لوگوں کی نگاہیں ' ان کی موجودگی ' ان کی پسند و ناپسند ' ان کی مدد و تعاون ' یہ سب دین کی راہ پر قائم رکھنے کے لیے ناگزیر ہیں ۔

جیسے ہی آدمی اجتماعیت کو ترک کرتا ہے ' وہ ریوڑ سے الگ ہو کر اپنی پگ ڈنڈی پر چل پڑنے والی بھیڑ کی طرح بہ آسانی اپنے دشمن ' شیطان کا تر نوالہ بن جاتا ہے ۔

○

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں :

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب لوگوں کو کوئی کام کرنے کا حکم دیتے تھے ' تو ایسے ہی کام کرنے کا حکم دیتے تھے جن کو کرنے کی وہ طاقت رکھتے تھے (بخاری) ۔

یہ حکمت دین کی اہم بنیاد ہے ۔

اس کا ماخذ خود قرآن کا یہ کلیہ ہے : لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا

امر و نہی ' انذار و تبشیر ہو ' فرائض ہوں یا نوافل و مستحبات ' مقاصد ہوں یا ذرائع مقاصد ' انسان پر اس کام کا بوجھ نہ ڈالنا چاہیے جس کا کرنا اس کے بس سے باہر ہو ۔ واعظین ' معلمین ' قائدین ' والدین ' افسر ' غرض سب کو یہ اصول پیش نظر رکھنا چاہیے ۔

دنیا کی بے ثباتی

حضرت علیؓ کا ایک اثر آفریں خطبہ

میں تمھیں دنیا سے ڈراتا ہوں' اس لیے کہ یہ بظاہر شیریں و خوش گوار' تروتازہ و شاداب ہے۔ نفسانی خواہشات اس کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی جلد میسر آجانے والی نعمتوں کی وجہ سے لوگوں کو محبوب ہوتی ہے۔ اور اپنی تھوڑی سی (آرائشوں) سے مشتاق بنا لیتی ہے۔ وہ (جھوٹی) امیدوں سے سجی ہوئی' اور دھوکے اور فریب سے بنی سنوری ہوئی ہے۔ نہ اس کی مسرتیں دیرپا ہیں اور نہ اس کی ناگہانی مصیبتوں سے بے فکر رہا جا سکتا ہے۔ وہ دھوکے باز' ضرررساں' ادلنے بدلنے والی اور فنا ہونے والی ہے' ختم ہونے والی' اور مٹ جانے والی ہے' کھا جانے اور ہلاک کر دینے والی ہے۔ جب یہ اپنی طرف مائل ہونے والوں اور خوش ہونے والوں کی انتہائی آرزوؤں تک پہنچ جاتی ہے' تو بس وہی ہوتا ہے جو اللہ سبحانہ' نے بیان کیا ہے: (اس دنیاوی زندگی کی مثال ایسے ہے) ''جیسے وہ پانی جسے ہم نے آسمان سے اتارا' تو زمین کا سبزہ اس سے گھل مل گیا اور (اچھی طرح پھلا پھولا) پھر سوکھ کر تنکا تنکا ہو گیا' جسے ہوائیں (ادھر سے ادھر) اڑائے پھرتی ہیں اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے''۔ (الکہف ۱۸: ۴۵)

جو شخص اس دنیا کا آرام پاتا ہے تو اس کے بعد اس کے آنسو بھی بہتے ہیں۔ اور جو شخص دنیا کی مسرتوں کا رخ دیکھتا ہے' وہ مصیبتوں میں دھکیل کر اس کو اپنی بے رخی بھی دکھاتی ہے۔ اور جس شخص پر راحت و آرام کے ہلکے ہلکے چھینٹے پڑتے ہیں' اس پر مصیبت و بلا کے طوفان بھی آتے ہیں۔ یہ دنیا ہی کے مناسب حال ہے کہ صبح کو کسی کی دوست بن کر اس کا (دشمن سے) بدلہ چکائے اور شام کو یوں ہو جائے کہ گویا کوئی جان پہچان ہی نہ تھی۔ اگر اس کا ایک گھونٹ شیریں و خوش گوار ہے تو دوسرا حصہ تلخ اور بلاانگیز' جو شخص بھی دنیا کی تروتازگی سے اپنی کوئی تمنا پوری کرتا ہے تو وہ اس پر مصیبتوں کی مشقتیں بھی لاد دیتی ہے۔ جس کی شام امن و سلامتی کے بال و پر کی حامل ہوتی ہے' اس کی صبح خوف کے پروں پر ہوتی ہے۔ وہ دھوکے باز ہے اور اس کی ہر چیز دھوکا۔ وہ خود بھی فنا ہو جانے والی ہے اور

اس میں رہنے والا بھی فانی ہے۔ اس کے کسی سامان میں، سوا زادتقویٰ کے کوئی بھلائی نہیں ہے۔ اس سے جو شخص کم حصہ لیتا ہے، وہ اپنے لیے راحت کے سامان بڑھا لیتا ہے، اور جو دنیا کو زیادہ سمیٹتا ہے وہ اپنے لیے تباہ کن چیزوں کا اضافہ کر لیتا ہے، (حالانکہ) اسے اپنے مال و متاع سے بھی جلد ہی الگ ہونا ہے۔ کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جنھوں نے دنیا پر بھروسہ کیا اور اس نے انھیں مصیبتوں میں ڈال دیا، کتنے ہی اس پر بھروسہ کیے بیٹھے تھے جنھیں اس نے پچھاڑ دیا، کتنے ہی رعب و طنطنہ والے تھے، جنھیں حقیر و پست بنا دیا اور کتنے ہی نخوت و غرور والے تھے جنھیں ذلیل کر کے چھوڑا۔ اس کی بادشاہی دست بدست منتقل ہونے والی چیز، اس کا سرچشمہ گدلا، اس کا خوش گوار پانی کھاری، اس کی حلاوتیں ایلوا (کے مانند تلخ) ہیں۔ اس کے کھانے زہر ہلاہل، اور اس کے اسباب و ذرائع کے سلسلے بودے ہیں۔ زندہ رہنے والا معرض ہلاکت میں ہے اور تندرست کو بیماریوں کا سامنا ہے۔ اس کی سلطنت چھن جانے والی، اس کا زبردست زیر دست بننے والا، مال دار بدبختیوں کا ستایا ہوا اور ہمسایہ لٹا لٹایا ہوا ہے۔ پھر اس کے بعد سکرات اور یوم جزا میں پیش ہونے کے مشکل مراحل در پیش ہوں گے: "تاکہ اللہ برائی کرنے والوں کو ان کے عمل کا بدلہ دے، اور ان لوگوں کو اچھی جزا سے نوازے جنھوں نے نیک رویہ اختیار کیا ہے"۔ (النجم ۵۳: ۳۱)

کیا تم انھی سابقہ لوگوں کے گھروں میں نہیں بستے جو لمبی عمروں والے، پائیدار نشانیوں والے، بڑی بڑی امیدیں باندھنے والے، زیادہ گنتی و شمار والے اور بڑے لاؤ لشکر والے تھے؟ وہ دنیا کی کس طرح پرستش کرتے رہے، اور اسے آخرت پر کیسی کیسی ترجیح دیتے رہے۔ پھر بغیر کسی ایسے زاد و راحلہ کے، جو انھیں راستہ طے کر کے منزل تک پہنچاتا، چل دیے۔ کیا تمھیں کبھی یہ خبر پہنچی ہے کہ دنیا نے ان کے بدلے میں کسی فدیہ کی پیشکش کی ہو یا انھیں کوئی مدد بہم پہنچائی ہو یا اچھی طرح ان کے ساتھ رہی ہو؟ بلکہ اس نے تو ان پر مصیبتوں کے پہاڑ توڑے، آفتوں سے انھیں عاجز و درماندہ کر دیا اور لوٹ لوٹ کر آنے والی زحمتوں سے انھیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور ناک کے بل انھیں خاک پر پچھاڑ دیا اور اپنے کھروں سے کچل ڈالا، اور ان کے خلاف حوادث زمانہ کا ہاتھ بٹایا۔

تم نے تو دیکھا ہے کہ جو ذرا دنیا کی طرف جھکا اور اسے اختیار کیا اور اس سے لپٹا تو اس نے (اپنے تیور بدل کر ان سے کیسی) اجنبیت اختیار کر لی یہاں تک کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس سے جدا ہو کر چل دیے۔ اس نے انھیں بھوک کے سوا کچھ زاد راہ نہ دیا، اور ایک تنگ جگہ کے سوا کوئی ٹھہرنے کا سامان نہ کیا، اور سوا گھپ اندھیرے کے کوئی روشنی نہ دی اور ندامت کے سوا کوئی نتیجہ نہ دیا، تو کیا تم اسی دنیا کو ترجیح دیتے ہو، یا اسی پر مطمئن ہو گئے ہو، یا اسی پر مرے جا رہے ہو؟ ارشاد خداوندی ہے: "جو لوگ بس اس دنیا کی زندگی اور اس کی خوش نمائیوں کے طالب ہوتے ہیں ان کی کارگزاری کا

سارا پھل ہم یہیں ان کو دے دیتے ہیں اور اس میں ان کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جاتی۔ مگر آخرت میں ایسے لوگوں کے لیے آگ کے سوا کچھ نہیں ہے (وہاں معلوم ہو جائے گا کہ) جو کچھ انھوں نے دنیا میں بنایا وہ سب ملیامیٹ ہو گیا اور اب ان کا سارا کیا دھرا محض باطل ہے" (ہود ۱۱: ۱۵-۱۶)۔ جو دنیا پر اعتماد کرے' اور اس میں بے خوف و خطر ہو کر رہے' اس کے لیے یہ بہت برا گھر ہے۔

جان لو' اور حقیقت میں تم جانتے ہی ہو کہ (ایک نہ ایک دن) تمھیں دنیا کو چھوڑنا ہے اور یہاں سے کوچ کرنا ہے۔ ان لوگوں سے عبرت حاصل کرو جو کہا کرتے تھے کہ ہم سے قوت و طاقت میں کون زیادہ ہے۔ انھیں لاد کر قبروں تک پہنچایا گیا مگر اس طرح نہیں کہ انھیں سوار سمجھا جائے۔ انھیں قبروں میں اتار دیا گیا' مگر وہ مہمان نہیں کہلاتے۔ پتھروں سے ان کی قبریں چن دی گئیں' اور خاک کے کفن ان پر ڈال دیے گئے اور گلی سڑی ہڈیوں کو ان کا ہمسایہ بنا دیا گیا ہے۔

وہ ایسے ہمسائے ہیں کہ جو پکارنے والے کو جواب نہیں دیتے اور نہ زیادتیوں کو روک سکتے ہیں اور نہ رونے دھونے والوں کی پروا کرتے ہیں۔ اگر بادل (جھوم کر) ان پر برسیں تو خوش نہیں ہوتے۔ اور قحط آئے' تو ان پر مایوسی نہیں چھا جاتی۔ وہ ایک جگہ ہیں' مگر الگ الگ۔ وہ آپس میں ہمسائے ہیں مگر دور دور۔ پاس پاس ہیں' مگر میل ملاقات نہیں۔ قریب قریب ہیں' مگر ایک دوسرے کے پاس نہیں پھٹکتے۔ وہ بردبار بنے ہوئے بے خبر پڑے ہیں۔ ان کے بغض و عناد ختم ہو گئے اور کینے مٹ گئے۔ نہ ان سے کسی ضرر کا اندیشہ ہے' نہ کسی تکلیف کے دور کرنے کی توقع ہے۔

ارشاد الٰہی ہے: "سو دیکھ لو' ان کے مسکن پڑے ہوئے ہیں جن میں ان کے بعد کم ہی کوئی بسا ہے' آخر کار ہم ہی وارث ہو کر رہے"۔ (القصص: ۵۸)

انھوں نے زمین کے اوپر کا حصہ اندر کے حصہ سے' اور کشادگی اور وسعت تنگی سے' اور گھر بار پردیس سے' اور روشنی اندھیرے سے بدل لی ہے' اور جس طرح ننگے پیر اور ننگے بدن پیدا ہوئے تھے' ویسے ہی زمین میں (پیوند خاک) ہو گئے' اور اس دنیا سے صرف عمل لے کر ہمیشہ کی زندگی اور سدا رہنے والے گھر کی طرف کوچ کر گئے۔ جیسا کہ اللہ سبحانہ نے فرمایا ہے: كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيدُهُ وَعْدًا عَلَيْنَا إِنَّا كُنَّا فَاعِلِينَ "جس طرح ہم نے مخلوقات کو پہلی دفعہ پیدا کیا تھا' اسی طرح دوبارہ پیدا کریں گے' اس وعدہ کو پورا کرنا ہمارے ذمہ ہے' اور ہم اسے ضرور پورا کر کے رہیں گے"۔ (الانبیا ۲۱: ۱۰۴) (نہج البلاغہ' انتخاب: عبدالحئی ابڑو)

کام کی بات

☆ نگاہیں نیچی رکھو

☆ سر اٹھا کر چلو

☆ زبان کی حفاظت کرو

☆ ہاتھ نہ پھیلاؤ

☆ پشت نہ دکھاؤ

☆ گردن نہ اکڑاؤ

☆ پیٹ کے ہلکے نہ ہو

☆ پاؤں نہ پٹخو

☆ ہتھیلی پر جان رکھو

—— اللہ سے اچھی امید رکھو!

(خیر خواہ)

عقیدہ اور علم

عبد القدیر سلیم

علم کی بیشتر صورتیں ادراکی تجربے کی مرہون منت ہوتی ہیں۔ ادراکی تجربہ (cognitive experience) کی عموماً تین صورتیں ہوتی ہیں: (۱) حسی تجربہ (sense experience)، (۲) تفکر (discusive thinking)، اور (۳) وجدان (intuition)۔

حسی تجربہ، حصول علم کی نہایت بنیادی شکل ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کے بغیر تفکر بھی کام نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ یہی بنیادی حسی مواد فراہم کرتی ہے، جسے تفکر اور تعقل کے عمل سے گزار کر ہم نتائج اخذ کرتے ہیں۔ اسی کی مدد سے ہم عالم خارجی کے خدوخال متعین کرتے ہیں، یا ان سے آگاہی حاصل کرتے ہیں، اسی کی مدد سے ہم اشیا اور معروض کی حسی صفات سے آگاہی پاتے ہیں۔ تمام فطری، اور بیشتر سماجی علوم کی بنیادیں حسی تجربے ہی میں پیوست ہیں۔ حسی تجربے کے طریقے، مشاہدہ اور تجربہ ہیں۔

مشاہدہ، اپنے نفس یا فطرت کے ایسے راست ادراک کو کہہ سکتے ہیں (خواہ خالی حواس کے ذریعے کیا جائے، یا حواس کی مدد کے لیے خصوصی مصنوعی آلات کی مدد سے)، جس سے ہم اپنے نفس اور اس کے ماحول قریب و بعید سے شناسائی حاصل کرتے ہیں۔ حسی مواد (sense data) ہی فطری علوم کا موضوع گفتگو بنتا ہے، جس کی توجیہ اور تعلیل کے لیے یہ ایک تصوراتی نظام قائم کر دیتا ہے۔

تفکر اور تعقل کے نتیجے میں ہمیں ''منطقی علم'' حاصل ہوتا ہے۔ منطقی علم کے لیے تفکر کی دو اہم صورتیں ہیں، تحلیل و تجزیہ (analysis) اور ترکیب و تمزیج (synthesis)۔ اول الذکر استخراجی فکر کی صورت ہے، اور ثانوی الذکر سے استقرائی علم حاصل ہوتا ہے۔ ان دونوں طریق میں یہ بات مشترک ہے کہ حسی مواد جو ہمیں اپنے وصول کنندہ اعضا (receptive organs) سے حاصل ہوتا ہے، اسی کو یہ فکری وظائف نظم و ترتیب عطا کرتے ہیں اور اس طرح عام مفروضات کے بارے میں

ایک منظم معلومات کا ذخیرہ (systematic body of knowledge) وجود میں آتا ہے' جسے عام طور پر سائنس کہا جاتا ہے۔ تاہم یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ منطقی اور تصوریتی (conceptual knowledge) بڑی حد تک علامتی (symbolic) ہے' کیوں کہ اس کے حصول کے لیے ہم نے جن تصورات سے کام لیا ہے' وہ عام تصورات (general concepts) ہوتے ہیں اور یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ ان عام تصورات کی تشکیل میں ہمارے ادراک' ہماری دلچسپیوں' پسند و ناپسند اور صلاحیت کی حدود کو بھی دخل ہوتا ہے۔

تاہم علم کی یہ دونوں صورتیں ہمارے لیے مفید ثابت ہوتی ہیں۔ عالم معروض کی اشیا پر گرفت حاصل کرنے اور اسے کنٹرول کرنے کے لیے حسی ادراک اور منطقی علم ہی ہمارے آلۂ کار ہیں۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ علم کی ان صورتوں کی حیثیت بڑی حد تک عملی ہے۔ یہ علوم ہمیں "اشیا پر جہاں گیری" عطا کرتے ہیں' اس لیے مفید ہیں۔ ان کے ذریعے ہم اپنی کائنات کی تسخیر کرتے ہیں اور اس پر کنٹرول حاصل کرتے ہیں۔

تاہم فلسفہ کی ایک اہم روایت نے حقیقی علم اور اشیا کی حقیقی ماہیت کی دریافت کے سلسلے میں حصول علم کے ان ذرائع کو تشکیک کی نظر سے دیکھا ہے۔ افلاطون' حسی ارتسامات (sense impressions) کے متغیر عالم کے مقابلے میں ازلی صور (eternal forms) کو حقیقی تسلیم کرتا ہے۔ اول الذکر متلوّن اور متغیر ہیں' جب کہ ثانوی الذکر کو ثبات اور دوام حاصل ہے۔ اس لیے وہ زیادہ حقیقی ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے خواب کے مقابلے میں عالم بیداری کو حقیقی مانتے ہیں۔ افلاطون کے نزدیک اول الذکر کا علم' علم ہی نہیں' محض "رائے" یا "گمان" (opinion) ہے۔ افلاطون کے خیال میں "علم" کی اصطلاح صرف ازلی صور کے عرفان ہی کے لیے استعمال کی جا سکتی ہے۔

حسی اِرتسامات اور ان کے نتیجے میں حاصل ہونے والے علم پر افلاطون کی اس تنقید کے خلاف فہم عام (common sense) کی جوابی تنقید عموماً یہ ہوتی ہے کہ "ادراکی معروض" (perceived object) عام طور پر "معقولی" یا "تصوریتی معروض" (conceived object) کی بہ نسبت زیادہ حقیقی محسوس ہوتا ہے۔ حسی تجربے میں ہم جس معروض سے دوچار ہوتے ہیں' وہ ہمیں حقیقتاً موجود محسوس ہوتا ہے' جب کہ تحلیل و تعقل کے نتیجے میں جو تصور قائم ہوتا ہے' اس میں حقیقت کی وہ حرارت اور زندگی نہیں ہوتی' بلکہ وہ ایک دھندلا اور غیر حقیقی تصور ہی ہوتا ہے۔

برگساں نے بھی تحلیل اور تعقل اور نام نہاد سائنٹی فک علم کی تنقید کی ہے۔ اس کے خیال میں تحلیل سے اشیا کی حقیقی ماہیت تک رسائی نہیں ہوتی' بلکہ اس کے مختلف اظہارات (expressions) ہی کا پتہ چلتا ہے۔ تحلیل و تجزیے کے ذریعے ہم غروب آفتاب کے منظر کے حقیقی مفہوم سے روشناس

نہیں ہوتے' بلکہ اس تجربے کو ہم روشنی' سنہرے رنگ' شفق' بادل وغیرہ کے تصورات اور پھر آخر کار رنگ و نور کی سادہ صفات میں منقسم کر لیتے ہیں۔ تاہم حسی صفات کا مجموعہ "غروب آفتاب" جزوی notations کو حقیقی اجزا (real parts) نہیں کہا جا سکتا۔ اگر تصوراتی تجزیہ ہمیں حقیقی اجزا سے روشناس کرا سکتا' تو شاید ہم ان اجزا کو باہم جوڑ کر اصل معروض کی تشکیل کر لیتے۔ مگر علامتی notations کے ذریعے ایسا ممکن نہیں ہے۔ تعقل کے لیے یہ تو آسان ہے کہ وہ کسی معروض کو اجزا میں تقسیم کر دے' اور ان کی تحلیل و تجزیہ کر کے انھیں الگ الگ خانوں میں رکھ دے مگر جب وہ انھیں جوڑنے کی کوشش کرتا ہے تو جو چیز حاصل ہوتی ہے' وہ زندہ حقیقت نہیں ہوتی' بلکہ اس کا ایک بے جان خاکہ ہوتا ہے۔ یہ بات کچھ ایسی ہی ہے' جیسے ہم کسی حیوان یا پودے کو اس کے اجزائے ترکیبی میں منقسم کر دیں کہ ان سادہ اجزا کے ذریعے اس کی تفہیم آسان ہوگی' لیکن جب ہم ان اجزا کو دوبارہ جوڑ کر اصل معروض کی تشکیل کرنا چاہیں گے تو یہ ممکن نہ ہو گا۔ تاہم یہ بات ضرور ہے کہ اس تجزیے سے معروض کے بارے میں "عملی معلومات" ضرور حاصل ہو جائیں گی۔

برگساں کے خیال میں سائنس اپنی اصلیت کے اعتبار سے "افادیتی" (utilitarian) ہے' اور اس طریق کے اعتبار سے غلط ہے۔ چونکہ اس کی دل چسپی عملی ہے' اس لیے اسے معروض کی اصل ماہیت سے دلچسپی نہیں۔ بلکہ محض اس کے استعمال اور manipolation سے دلچسپی ہے۔ مثلاً وہ ذی حیات کو چیر پھاڑ کر اور ایک متحرک کو جامد بنا کر اس کا مطالعہ کرتی ہے' اس لیے وہ حرکت اور تغیر سے ناآشنا رہتی ہے۔ ہم جامد کی اکائیوں کو جمع کر کے حرکت کو تشکیل نہیں دے سکتے۔ برگساں کے خیال میں حقیقت نام ہے حیات کا' حرکت کا' دوران کا' تسلسل (continuity) کا جب کہ منطق اور سائنس ہمیں ایسے تصورات دیتے ہیں جو غیر متحرک' بے زماں (timeless) اور مردہ ہوتے ہیں۔ محض ان پر تکیہ کرنا علم حقیقی سے محروم ہونا ہے۔ علم حقیقی کا مصدر وجدان ہے۔

جہاں تک عقیدے کا تعلق ہے' عام مفہوم میں یہ انتہائی حتمی اور پختہ علم کو کہا جاتا ہے۔ ظن اور قیاس کے مقابلے میں ہم اسے ایک مضبوط اساس رکھنے والا' غیر متزلزل وقوف کہہ سکتے ہیں۔ یوں دیکھیں تو عقیدہ کا لفظ حسی بنیاد پر حاصل ہونے والے علم کی ایک پختہ صورت کے لیے بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ (مثلاً میں یہ کہوں کہ یہ میرا عقیدہ ہے کہ اس وقت دن ہے اور سورج نکلا ہوا ہے۔ یعنی مجھے اس بات کا انتہائی یقین ہے)۔ عقیدہ' تعقل کا نتیجہ بھی ہو سکتا ہے (مثلاً یہ کہنا کہ میرا یہ عقیدہ ہے کہ ہر آدمی کو ایک دن مرنا ہے)۔ اس طرح عقیدہ' وجدان کی پیداوار بھی ہو سکتا ہے (جیسے مجھے اپنے وجود کا علم' ایک سادہ حقیقت کا ادراک ہے)۔

عقیدے کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ معروضات (objects) یا ان کے وظائف (مثلاً اشیا کے

حقیقی وجود اور ان کی فعلیت) پر مکمل یقین کا نام ہے۔ اشیا کے خارجی وجود' دوسرے اذہان کے موجود ہونے' اللہ تعالیٰ اور "عالم غیب" پر ایمان' عقیدہ کہلائیں گے۔ عقیدہ کسی قضیے پر یقین کی صورت میں بھی ہو سکتا ہے (مثلاً سائنسی' مابعد الطبیعیاتی' اخلاقی یا جمالیاتی قضایا کی صداقت پر یقین) جہاں تک اشیا اور معروضات پر عقیدہ کا تعلق ہے' ان کے وجود کی صداقت پر عقیدہ' فوری (immediate) اور راست (direct) ہوتا ہے جب کہ قضایا کی صداقت پر عقیدہ عموماً تفکر کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ یہ قیاس (inference) سے حاصل ہوتا ہے یا وجدان سے ماخوذ ہوتا ہے۔

فلاسفہ نے عقیدے سے متعلق نظریات کو تین جماعتوں میں تقسیم کیا ہے: فکری (intellectual)' احساسی (affective) اور ارادی (volitional)۔ فکری نظریے کے مطابق تمام عقائد' انسان کے حسی ادراکات سے پیدا ہوتے ہیں' جب کہ احساسی نظریے کے مطابق اگر یاد (memory) اگر غیر معمولی طور پر روشن اور واضح (vivid) ہو تو عقیدے ہو جاتی ہے (ہیوم)۔ ولیم جیمز نے اپنے شہرہ آفاق مضمون The will to believe میں عقیدے کے ارادی نظریے کو بڑی قوت اور خوبی سے پیش کیا ہے۔ اس کے خیال میں انسان کو یہ حق حاصل ہے' بلکہ بسا اوقات یہ ضروری بھی ہے کہ وہ ان چیزوں پر عقیدہ رکھے' جن کے لیے کافی شواہد بھی موجود نہیں ہیں۔ لیکن "عقیدے کی آمادگی" کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ انسان بے دریغ ہر رطب و یابس پر ایمان لے آئے' بلکہ اس میں ایک محتاط انتخاب اور پیش نظر امور میں سے اس چیز کو اختیار کرنا مضمر ہے' جو حیات انگیز' پرشکوہ اور طاقت ور ہو' کیوں کہ عدم فیصلہ خود ایک منفی فیصلے کے مساوی ہوتا ہے۔

علم حِسّی اور تعقل یا منطقی علم اور عقیدے میں ایک اہم فرق دونوں کی جہت کا ہے۔ علم محض یا وقوف' کسی قسم کے جذبے سے عاری ہوتا ہے' جب کہ عقیدے میں عقیدت (reverence) پائی جاتی ہے۔ اس میں ایک ماورائی احساس ہے' معروض عقیدہ کی عظمت' بڑائی یا کم از کم اس کی غیر معمولی اہمیت کا۔ علم محض ایک خالی وقوف ہے اور ایک محدود معنی میں ہم ایک کمپیوٹر کو' جس کے خزینہ یاد میں بہت سی معلومات جمع کر دی گئی ہیں' اور اسے انھیں استعمال کرنے (manipulation) کے قواعد بھی سکھا دیے گئے ہیں' ایک عالم کہہ سکتے ہیں' کیوں کہ "بربنائے علم" وہ ہمارے بہت سے سوالوں کا جواب نہایت صفائی اور صحت کے ساتھ دینے کی قدرت رکھتا ہے' اور دیتا ہے۔ لیکن اس کے ذخیرۂ علم کو ہم "عقیدہ" نہیں کہہ سکتے' کہ اس اصطلاح میں وقوف اور معلومات کے علاوہ احساس اور ارادہ بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ اس بنا پر ہمارا خیال ہے کہ علم کی تین شاخوں' حسی علم' تعقل اور وجدان میں' آخر الذکر' عقیدے سے قریب ترین ہے۔

عہد جدید کے چیدہ فلاسفہ نے وجدان اور عقیدے کو اپنے نظام فکر کی ایک اہم بنیاد کے طور پر

تسلیم کیا ہے، ان میں کانٹ، برگساں اور اقبال شامل ہیں۔

کانٹ نے Critique of Qure Reason میں ظاہر کیا ہے کہ اللہ کا وجود عقلی طور پر ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے وجود الٰہی کے لیے کونیاتی، وجودیاتی اور علت کے دلائل کو غیر تسلی بخش قرار دیا۔ یہ دلائل کمزور ہیں، کیوں کہ یہ تضادات کو ابھارتے ہیں۔ اس کی بجائے وہ وجودِ الٰہی کا اثبات عقل کی جگہ اخلاقی بنیادوں پر کرتا ہے۔ یہ ہمارے اخلاقی شعور کا تقاضا ہے۔ اللہ ہمارے علم کا معروض نہیں، نہ ہمیں اس کا تجربہ ہوتا ہے، لیکن ہمارا اخلاقی شعور اس بات کا متقاضی ہے کہ اعلیٰ اخلاقی قدریں رکھنے والی ایک ایسی زندہ و بینا اور قادر ہستی موجود ہو۔ اپنی Critique of Judgement میں وہ بڑی صفائی سے یہ بتاتا ہے کہ ہمارے اخلاقی اقدار کے نظام نیز یہ احساس کہ کائنات ایک صالح اور قدر و قیمت کے حامل پس منظر میں موجود نظر آتی ہے، اللہ کے وجود کی طرف واضح اشارا کرتے ہیں، لیکن یہ خدا ہمارے حسی تجربات یا عقل محض کے وظائف سے نہیں دریافت کیا جا سکتا بلکہ اس کی معرفت وجدانی ہے۔ اللہ کا وجود تسلیم کرنا، محض ایک خواہش کی تسکین نہیں بلکہ اپنی فطرت کے تقاضے کی تکمیل ہے۔ اگر ہم اللہ پر ایمان نہ لائیں تو ہم گویا اپنے وجود کی حقیقی منطق اور اس کے اسلوب کی خلاف ورزی کریں گے۔ کانٹ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اللہ ہی وہ غائی حقیقت ہے جس سے انسان کا ذہن ایک گہرے اندرونی ربط (عقیدے) میں بندھا ہوا ہے۔ اس طرح اللہ محض ایک اخلاقی مفروضہ نہیں رہتا، بلکہ ایک عظیم حقیقیت کے طور پر منکشف ہوتا ہے، اگرچہ وہ حسی تجربے اور منطقی قیاس سے ماورا ہے۔

ہیگل کے نزدیک اگرچہ وجدان، حقیقت تک رسائی کا راستہ نہیں، اور وہ جیکوبی کے "عقیدے" کے نقطہ نظر کا ناقد ہے تاہم بقول ڈاکٹر رادھاکرشن اس کے فلسفہ وحدیت کی بنیاد بھی وجدان ہی ہے۔ غائی وجود Absolute spirit کا ہے۔ تمام کائنات ایک واحد روحانی عضویہ ہے، جو اپنی تکمیل انا self relaization کے لیے ایسے صور اور تصورات کو جنم دیتا ہے، جو اس سے متغائر نظر آتے ہیں، لیکن درحقیقت اس کی غائی تکمیل کے لیے ضروری ہیں۔ اضداد کی یہ جدلیت، فطرت میں بھی کارفرما ہے، جس کے ذریعے لامحدود روح اپنی تکمیل کے مراحل طے کر رہی ہے۔ مگر جدلیاتی طریق سے تو "احد" کے تصور تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ بقول کانٹ، کوئی معقولی تصور، بغیر کسی سابق وجدان کے ممکن نہیں۔ اس طرح "احد" کا یہ تصور، جو ہیگل کے فلسفیانہ نظام کی مرکزی کیل ہے، ایک وجدان کا اظہار ہے، نہ کہ کسی جدلی تعقل کا ثمرہ۔ ولیم جیمز نے ہیگل کے بارے میں بڑا معنی خیز اشارا کیا ہے، جب وہ کہتے ہیں کہ ایک ہستی کامل، جو تمام غیر کو اپنے اندر جذب کیے ہوئے ہے، ہیگل کے فلسفے پر حاوی ہے، اور اس کا کون سا قاری اس میں شک کر سکتا ہے کہ یہ اس کے شعور پر صوفیانہ موڈ ہی

سے وجود میں آ سکتی ہے؟ (رادھاکشن 'ڈاکٹر An Idealist view of Life '۱۹۸۰' ص ۶۵)

اقبال' جمود اور سکوت کے برخلاف' حرکت اور حیات کو کائنات کی اصل حقیقت قرار دیتے ہیں۔ کائنات کی اس طرح تفہیم کے لیے جو طریق موزوں ہے' وہ تحلیل و تجزیہ کا نہیں' بلکہ وہی ہو سکتا ہے' جو اس متحرک حقیقت کے قدم بقدم چل سکے' اور اس کی لامحدود امنگوں کے ساتھ پرواز کر سکے۔ یہ یقین' ایمان اور وجدان کا طریق ہے' جسے اقبال نے بعض جگہ ''عشق'' کا نام بھی دیا ہے اور عقل کے ساتھ اس کا حریفانہ تعلق قائم کیا ہے۔

قرآن مجید میں ''علم'' کا لفظ اپنے سبھی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ''علم رکھنے والے' اور وہ لوگ جو نہیں جانتے برابر نہیں ہو سکتے''۔ (الزمر ۳۹:۹) لیکن ''عقیدے'' کا لفظ کہیں استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ تاہم علم حقیقی کے لیے وحی' ایمان اور ایقان کے مشتقات استعمال ہوئے ہیں اور اس ایمان و ایقان کی تحسین کی گئی ہے' جو وحی پر مبنی ہو' کیوں کہ کائنات کی غائی حقیقت اللہ تعالیٰ کی ذات اور سارے علم کا سرچشمہ' خود اللہ تعالیٰ کی صفت علم ہے۔ لیکن یہ علم' محض وقوف اور تجرید نہیں۔ اسلام نے علم و عمل کو لازم و ملزوم قرار دیا ہے۔ قرآن مجید کی پہلی ہی سورہ میں "اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ" کے ساتھ ہی "وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ" کے الفاظ آئے ہیں۔ گویا ایمان کے ساتھ اللہ کی عملی اطاعت اور دنیا میں (وسیع معنوں میں) معاش کو اس کے حکم کے مطابق استوار کرنا' ساتھ ساتھ جاتے ہیں۔ علم و عمل کے اس لزوم نے مسلمانوں کے ادب میں ''علم'' کے ساتھ ساتھ ''حکمت'' کے لفظ کو رواج دیا ہے' اور حکمت نام ہے دانائی کا۔ دانائی' زندگی کی اعلیٰ اقدار کی شناسائی؛ ان کے فہم' اور ان اقدار کے حصول کے لیے جدوجہد کا نام ہے۔ یہ علم' ایمان' ایقان یا عقیدہ' انسان کے ظاہر و باطن کو سنوارتا ہے' اور اس کی زندگی میں ایک کلیت و ہمہ گیری پیدا کرتا ہے' دراصل یہی فلسفہ کا بھی مقصود ہے۔ یہاں فلسفہ و حکمت' اور ایمان و عقیدہ باہم آمیز ہو جاتے ہیں۔ امام غزالیؒ کے خیال میں علم کا مقصد' سعادت ابدی کا حصول ہے۔ (اصل السعادۃ فی الدنیا و الآخرۃ ھو العلم)۔ اسی لیے مسلمانوں کی دعاؤں میں ''علم نافع'' کی درخواست کی جاتی ہے۔ مگر جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے' اس سے مراد محض دنیا کا نفع نہیں' بلکہ دنیا و آخرت دونوں کی فلاح ہے۔ اور اسی معنوں میں علم کا یہ تصور' مروجہ نتائجیت کے تصور سے مختلف ہے' جس میں بظاہر محض دنیاوی ''نقد قدر'' (cash value) ہی علم کی غایت قرار پاتی ہے۔

یہ بات بظاہر تعجب خیز محسوس ہوتی ہے کہ مسلم فلاسفہ کا پہلا گروہ جو معتزلہ کے نام سے مشہور ہوا' اور جسے غزالی کے انتہائی مخالف قطب پر رکھا جا سکتا ہے' علم و عمل کی وحدت سے متعلق وہی رجحان رکھتا تھا' جو غزالی اور دوسرے اشاعرہ و علما کا تھا۔ معتزلہ نے گناہِ کبیرہ کے مرتکب کو کافر کہا'

کیوں کہ ان کے خیال میں علم و ایمان کے ہوتے ہوئے عمل کی گمراہی (یعنی گناہ کا صدور) ممکن ہی نہیں۔ عمل، علم ہی کا ثمرہ یا عکس (projection) ہے، اور اس کے مشاہدے سے علم و ایمان کی کیفیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

دراصل علم و عمل کی یہ ہم آہنگی ہی ہے، جو اسلام سے کسی نہ کسی حیثیت میں وابستہ تمام مدارس فکر میں جھلکتی محسوس ہوتی ہے۔ یہاں فلسفہ، مذہب ہے اور مذہب، فلسفہ۔ نظریہ، عمل ہے اور عمل، عقیدہ۔ یہاں علم برائے علم کا کوئی تصور نہیں۔ ڈاکٹر رادھا کشن کو شاید ایسے ہی ایک مذہب کی تلاش تھی، جب انھوں نے لکھا کہ "ہم حیات سے معمور ایک مذہب، ایک زندہ فلسفے کے منتظر ہیں، جو عقائد و نظریات کی بنیادوں کی از سرنو تعمیر کرے اور زندگی کا ایک ایسا ضابطہ حیات مرتب کرے، جس کی انسان اپنی عزت نفس اور مسرت کے ساتھ (with self respect and joy) پیروی کر سکے"۔
(رادھا کشن، ڈاکٹر: An Idealist view of Life، ۱۹۸۰، ص ۶۵)

فلسفے میں علم کی اس صورت کی، جسے ہم مذہب کی اصطلاح میں عقیدہ، ایمان یا ایقان کہتے ہیں، کیا اہمیت ہے؟ اقبال نے کہا تھا کہ:

یا مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار
جو فلسفہ لکھا نہ گیا خون جگر سے

اگر فلسفہ کو ایک زندہ اور متحرک قوت حیات بنانا ہے، یا زندگی کو فلسفہ پر استوار کرنا مقصود ہے، تو اسے ایسے نظام عقیدہ و ایمان سے وابستہ کرنا ہو گا، جو کائنات میں خیر کی قوت کا ساتھ دینے والا ہو، زندگی کو کائنات کی اندھی قوتوں کے ہاتھوں ظہور میں آنے والا ایک حادثہ نہ سمجھے، بلکہ اس کے تمام تر حسن و معنویت اور اقدار کے ساتھ اسے خالق کائنات کی حکمت و قدرت کا ایک مظہر خیال کرے۔ یہی عقیدہ، ایمان اور علم، زندگی اور فکر کو ہم آہنگ کرتا ہے اور ان میں افتراق کی بجائے اتحاد کو وجود میں لاتا ہے۔ یہاں فکر، ارادے اور احساس کی تثلیث ختم ہو جاتی ہے، حواس، تفکر اور وجدان میں توافق پیدا ہو جاتا ہے، اور حیات و کائنات میں کوئی دوئی باقی نہیں رہتی۔

لے Opinion کے لیے "ظن" یا "تخمینی" کی اصطلاح، افلاطون کے مفہوم کو بخوبی واضح کرتی ہے۔ قرآن مجید سے ظنی علم کے عبث ہونے کی تائید ملتی ہے: اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ | اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ع
"راہ بر ہو ظن و تخمین تو زبوں کار حیات"۔

رشتے کا اِنتخاب

مولانا اشرف علی تھانوی ؒ

مولانا ؒ کے ملفوظات پر مشتمل حکیم محمود احمد ظفر کے مرتبہ مضمون مطبوعہ الحسن لاہور سے ماخوذ۔

زوجین کی خوشحالی اور خوشگوار زندگی کی ضمانت محبت و مودت ہے۔ محبت و مودت کا انحصار کسی مادی شے پر نہیں کیوں کہ تمام مادی اشیا ناپائے دار اور غیر مستقل ہیں۔ ان پر منحصر محبت بھی ناپائے دار ہو گی۔ مثال کے طور پر کوئی بیوی اگر مال کی وجہ سے اپنے میاں سے محبت کرتی ہے تو میاں کے پاس جب مال نہیں رہے گا، محبت ختم ہو جائے گی۔ لہٰذا صحیح محبت و مودت کا انحصار پائے دار اور مستقل چیز پر ہونا چاہیے تاکہ محبت پائے دار اور اٹوٹ رہے۔ وہ پائے دار شے کیا ہے؟

"اور یہ یقینی بات ہے کہ توادد (باہمی محبت) میں جس قدر دخل دین کو ہے اتنا کسی چیز کو نہیں۔ سب علائق (تعلقات) قطع ہو جاتے ہیں، بجز دین کے۔ (اصلاح انقلاب امت، ج ۲، ص ۷ ۳)۔

جن لوگوں نے دین کو چھوڑ کر دوسری ناپائے دار مادی اشیا سے محبت کا رشتہ استوار کیا ہے، ان کی ازدواجی زندگی اکثر و بیشتر تنازعات کا شکار رہتی ہے:

"اس زمانے میں منکوحہ میں زیادہ تر جمال کو، ناکح (نکاح کرنے والے) میں زیادہ تر مال کو، دیکھتے ہیں، اور سب سے کم دین کو دیکھتے ہیں، اور باقی اوصاف میں آرا مختلف ہیں۔ حالانکہ ناقابل التفات یہی مال و جمال ہے اور سب سے زیادہ قابل التفات دین ہی ہے۔ اسی واسطے حدیث ؐ میں کہا گیا ہے: عورت سے چار وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے: شرافت کی وجہ سے، مال کی وجہ سے، خوب صورتی کی وجہ سے اور دین داری کی وجہ سے۔ تجھ کو دین دار عورت سے نکاح کرنا چاہیے...... مرد کے باب میں کہا گیا ہے: اگر تمھارے پاس ایسا شخص آئے جس کے اخلاق اور دین داری کو تم پسند کرتے ہو تو تم اپنی لڑکی کا نکاح اس سے کر دو، ورنہ زمین میں فتنہ اور بڑا فساد پھیلے گا۔ اس میں مال و جمال پر نظر نہ کرنے کا، اور دین پر نظر کرنے کا امر فرمایا ہے"۔ فتنہ اور بڑا فساد پھیلنے کی جو حدیث میں پیش گوئی فرمائی گئی ہے، وہ اس لیے کہ مال و جمال ناپائے دار اور فنا ہو جانے والی چیزیں ہیں۔ لہٰذا ان

پر منحصر محبت و مودت بھی ناپائے دار اور فانی ہوگی۔اس سے تعلقات بگڑیں گے اور فساد پھیلے گا۔

"مال و جمال کی عمر تو بہت ہی کم ہے۔مال ایک شب میں بے وفائی کر جاتا ہے اور جمال ایک بیماری میں ختم ہو جاتا ہے۔اور بعض امراض میں پھر واپس ہی نہیں آتا، جیسے آنکھ پھوٹ جائے یا چیچک نکل آئے اور داغ نہ جائیں، یا سر کے بال گر جائیں" (ایضاً)۔جب مقصود مال و جمال تھا اور وہ رخصت بلاعوض ہو گیا تو تمام تر محبت و الفت بھی جو اس پر مبنی تھی وہ بھی ختم ہوئی۔اور پھر زوجین ایک دوسرے کی نظر میں مبغوض ہو گئے اور نباہ ہمیشہ کے لیے مشکل ہو گیا۔بعض اوقات باقی رہا، تب بھی جہاں دین نہیں، وہاں دیکھا ہے کہ مال و جمال بقائے محبت کے لیے کافی نہیں۔کیوں کہ جہاں دین نہیں--- اور ظاہر ہے کہ بے دین آدمی کے نہ اخلاق درست ہوتے ہیں نہ اعمال و معاملات--- وہاں بداخلاقی، بدمعاملگی، بداعمالی، حقوق ضائع کرنا، خود پرستی اور خود غرضی سب کچھ ہوگا، جس سے نفرت کے اسباب فراہم ہوں گے۔جب شب و روز ایسے اسباب برابر واقع ہوتے رہیں گے تو کہاں تک ان میں محبت رہ سکتی ہے پس باہم کدورت و نااتفاقی اور غیظ و طیش پیدا ہونا شروع ہوگا۔حتیٰ کہ تمام مصالح زوجیت ضائع ہو جائیں گے۔ہم نے خود دیکھا ہے، بی بی حسن و جمال میں حور کا بچہ اور شوہر مال و منال میں قارون کے فرزند، مگر اکثر میاں کی بے دینی سے اور کہیں بی بی کی بدخلقی و بدمزاجی یا بدچلنی کے سبب میاں بیوی میں بول چال تک نہیں۔وہ اس کو دیکھ کر منہ پھیر لے، یہ اس کو دیکھ کر ناک بھویں چڑھائے۔یہ دوسری جگہ روٹی پکواتے پھریں، وہ باوجود مال ہونے کے الگ ایک ایک پیسہ کو ترسے۔بعض جگہ تو ہم نے دیکھا ہے کہ بی بی غایت نفرت کے سبب میاں سے پردہ کرتی ہے۔یہ ہیں مال و جمال ہونے کے بے دینی کے ثمرات۔پس اس کو مقصود سمجھنا ہی حماقت ہے" (ایضاً، ص ۲۸)۔

شبہ ہو سکتا ہے کہ کیا صرف دین داری ہی تلاش کی جائے یا یہ بھی دیکھا جائے کہ میاں کچھ کماتا بھی ہے یا نہیں۔بعض دفعہ نہیں بلکہ اکثر دفعہ نکھٹو ہونا بھی نفرت کا سبب بن جاتا ہے۔ہونے والے شوہر میں تین باتیں دیکھ لینا چاہییں:

"ایک قوت الاکتساب (کمانے کی قوت)، دوسرے کفایات (برابری) زیادہ تفاوت نہیں، تیسرے دین داری۔ان دونوں صورتوں میں زیادہ کاوش چھوڑ دے، ورنہ وہی بات پیش آوے گی جس کا ذکر حدیث میں ہے کہ جب خلق و دین میں کفات ہو تو نکاح کر دیا کرو ورنہ زمین میں فساد کبیر ہوگا۔(ایضاً، ص ۳۰-۳۱)۔

"ان معاملات پر اس طرح غور کیا جائے تو بات صحیح طریقہ سے ذہن میں بیٹھ جاتی ہے۔ایک یہ کہ جن صفات کو جس درجہ میں تم دوسروں میں ڈھونڈتے ہو، تم کو جس شخص نے لڑکی دی تھی جس

کی بدولت آج اپنی لڑکی کے باپ بن کر یہ جولانیاں دکھا رہے ہیں، کیا اس شخص نے بھی تمہارے لیے ایسی ہی تفتیش و کاوش کی تھی؟ دوسرے یہ کہ جب تم اپنی دختر کے لیے ان صفات کا شوہر تلاش کرتے ہو، انصاف کرو کہ تم نے جب اپنے فرزند کے لیے کسی کو لڑکی کی درخواست کی تھی، یا کرنے کا خیال ہی کیا، اپنے صاحبزادے میں بھی یہ صفات اسی درجہ کی دیکھ لی ہیں یا دیکھنے کا ارادہ ہے۔ تیسرے یہ کہ جس طرح لڑکوں میں بے شمار خوبیاں ڈھونڈی جاتی ہیں اگر دوسرا شخص تمھاری لڑکیوں میں اس کا دسواں حصہ خوبیاں اور ہنر بھی دیکھنے لگے تو میں یقین کرتا ہوں کہ تمام عمر ایک لڑکی بھی بیاہی نہ جائے" (ایضاً، ص ۳۱)۔

[عائلی زندگی کی ناخوشگواری کا ایک سبب یہ ہے کہ لوگ] لڑکی کے مال کو دیکھتے ہیں۔ در حقیقت یہ اس سے بھی بدتر ہے کہ لڑکی یا اس کے اولیا، مرد کے مال کو دیکھیں کیوں کہ یہ تو کسی درجہ میں، اگر اس میں غلو نہ ہو، امر معقول ہے، کیوں کہ مرد پر عورت کا نفقہ و مہر واجب ہوتا ہے تو اس پر استطاعت رکھنے کو دیکھنا مضائقہ نہیں، بلکہ ایک قسم کی ضروری مصلحت ہے۔ البتہ اس میں ایک قسم کا غلو کہ اس کو اور ضروری اوصاف پر ترجیح دی جائے، مذموم ہے۔ لیکن عورت کے مال دار ہونے پر نظر کرنا محض اس غرض سے کہ ہم اس سے فائدہ اٹھائیں یا ہم پر اخراجات وغیرہ کا بار کم پڑے گا، بڑی بے غیرتی اور بے حمیتی ہے...... اس کے علاوہ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ مال دار عورت نادار مرد کو کبھی خاطر میں نہیں لاتی۔ اس کو حقیر اور خادم سمجھتی ہے اور لڑکے کے والدین کا اس پر نظر کرنا کہ ایسی بہو کو بیاہ کر لائیں کہ جہیز بہت سا لائے اور بھی حماقت ہے ـــــ اول تو وہ جہیز بہو کی ملکیت ہے، کسی کو اس سے کیا۔ لیکن اگر یہ بھی سمجھا جائے کہ گھر میں رہے گا تو ہمارے بھی کام آئے گا، اول تو وہی بے حمیتی، دوسرے اگر اس کو گوارا بھی کر لیا جائے تو اس خیال کی لڑکے کو تو کسی درجہ میں گنجائش ہے مگر ساس سسر کو کیا واسطہ۔ آج صاحبزادہ صاحب اپنی رائے سے، یا بیوی کے کہنے سے، جدا ہو جائیں، بس ساری امیدوں پر پانی پھر جائے" (ایضاً)۔

"البتہ لڑکی کے زیادہ مفلس نہ ہونے پر، ایک مصلحت کی خاطر اور ایک مضرت کے دفع کرنے کے لیے نظر کی جائے تو وہ نازیبا نہیں بلکہ مناسب ہے۔ منفعت تو یہی ہے کہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ مفلس محض میں دو امر کی کمی ہوتی ہے۔ ایک سلیقہ کی، دوسری سیر چشمی کی۔ پس سلیقہ کی کمی سے اس میں خدمت کی لیاقت نہیں ہوتی اور اس سے کلفت ہوتی ہے۔ اور سیر چشمی کی کمی سے بعض اوقات ضروری خرچوں میں تنگی کرتی ہے، جس سے بعض اہل حقوق کے حقوق بھی ضائع ہوتے ہیں اور بعض مقامات پر شرمندگی بھی ہوتی ہے ـــــ بعض کو دیکھا گیا ہے کہ دفعتاً "مال و دولت کو دیکھ کر آنکھیں پھٹ جاتی ہیں، اور سلیقہ ہوتا نہیں۔ بس بے تمیزی سے اس کو اڑانا شروع کر دیتی ہے۔ چنانچہ اکثر تو

دولتوں کو یا بخل کی بلا میں مبتلا پایا' یا اسراف کی۔ ان میں اعتدال کم ہوتا ہے' اکثر دیکھا گیا ہے کہ خاوند کے گھر سے اس کو محبت نہیں ہوتی۔گھر میں بے حد بے برکتی ہوتی ہے۔ مرد کماتا کماتا تھک جائے مگر وہ اڑانے سے نہیں تھکتی۔ اس لیے مناسب یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے اپنے برابر والوں میں نکاح کا تعلق کرے (ایضاً' جلد ۲' ص ۴۲۔ ۴۳)۔

آج کل جہیز کی زیادتی کا جنون ہر لڑکے کے ذہن پر سوار ہے بلکہ اس سے زیادہ اس کے اولیا پر سوار ہے۔ مختلف قسم کی دوسری فرمائشیں لڑکی والوں سے لڑکے والوں کا روز مرہ کا معمول بن چکا ہے۔ اس وجہ سے کئی غریب گھروں کی بچیاں جہیز نہ ہونے کے سبب اپنے والدین کے ہاں بوڑھی ہو گئی ہیں اور ہو رہی ہیں۔ یہ طمع اور حرص کی ایک بدترین قسم ہے۔

اسی مرد کی دینی اور اخلاقی حالت اچھی ہو اور خدا کا خوف اس کے دل میں موجود ہو تو یقین کیجیے کہ وہ خانگی جھگڑے پیدا ہی نہیں ہوتے جو آج کل ہمارے معاشرے میں بے دینی' بدعملی اور حرص کی وجہ سے کثرت سے پیدا ہو رہے ہیں۔ اس وجہ سے نکاح سے قبل مرد کے عقیدہ و عمل کی چھان بین کر لینی چاہیے۔

"بعضے لوگ محض طمع مال یا جاہ میں یا اولاد [کا بہت خیال نہ کرنے کے رویے کی وجہ سے] یا دیگر خاندانی مصالح موہومہ کے سبب اپنی لڑکیوں کا کسی بدعقیدہ یا بدعمل مرد سے نکاح کر دیتے ہیں۔ اگر وہ بداعتقادی حد کفر تک پہنچی ہوتی ہے تو عمر بھر کے لیے علاوہ ظاہری کلفت' بحالت عدم توافق فی الدین لازم ہے۔ اور اگر حد کفر تک نہ بھی پہنچے تب بھی ہر وقت کا سوہان روح رہتا ہے" (ایضاً' ص ۱۴)۔

"مرد کی بے دینی تین طرح کی ہے: ایک اعتقادی اصولی' دوسری اعتقادی فروعی' تیسری اعتقادی عملی"۔

پہلی قسم کی مثال حضرت تھانویؒ نے یہ دی ہے کہ جیسے عورت مسلمان ہو اور مرد غیر مسلم' خواہ کتابی ہو یا غیر کتابی' ان کا نکاح درست نہیں۔ لیکن اگر مرد مسلمان ہو اور عورت غیر مسلم تو اس کی دو صورتیں ہیں: پہلی صورت یہ کہ عورت کتابی ہے یا غیر کتابی۔ اگر عورت غیر کتابی ہے' مثلاً ہندو یا سکھ' تو اس کا نکاح مسلمان مرد کے ساتھ جائز نہیں۔ لیکن اگر عورت کتابی ہے تو اگرچہ نکاح اس کا جائز ہے' لیکن مناسب نہیں۔ اور اس اختلاط سے پھر بہت سی خرابیاں جنم لیتی ہیں۔ جن کے اثرات بعد میں اولاد پر پڑتے ہیں۔۔ کیوں کہ ماں کا اثر ہر لحاظ سے اولاد پر باپ کی نسبت زیادہ ہوتا ہے۔

"بعضے لوگ بلاد یورپ سے ایسی عورت نکاح کر کے لاتے ہیں جو صرف قوم کے اعتبار سے عیسائی ہوتی ہے اور مذہب کے اعتبار سے محض لامذہب' سو سمجھ لینا چاہیے کہ ایسی عورت سے ہرگز

نکاح صحیح نہیں ہوتا۔ بعضے گو، لاتے ہیں عیسائی ہی عورت، مگر اس سے اس قدر مغلوب ہو جاتے ہیں کہ رفتہ رفتہ اپنے مذہب سے محض اجنبی ہو جاتے ہیں اور اس کا احتراز کا لازم ہونا بھی ظاہر ہے،، (ص ۱۱۴)۔

تیسری قسم یہ ہے کہ مرد فاسق و فاجر ہو اور عورت نیک و صالحہ۔ اس کا حکم یہ ہے کہ "فاسق مرد، عورت صالحہ کا کفو نہیں،،۔

یہ تو دینی کفات کا بیان ہے۔ اسلام میں نسبی کفات کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے، تاکہ نکاح کے بعد زوجین کے تعلقات میں کوئی خرابی واقع نہ ہو۔ اس سلسلہ میں عام طور پر دو کوتاہیاں کی جاتی ہیں: ایک افراطی، اور دوسری تفریطی۔ افراطی کوتاہی یہ ہے کہ نکاح کرنے والے مرد کی کسی وصف اور خوبی کو نظر میں نہ رکھا جائے۔ نہ لیاقت کو نہ دین وصحت اور نہ عمر اور وسعت مالیہ کو مرد اپنے خاندان اور اپنی برادری کا ہو، یہ بالکل لغو بات ہے۔ کیوں کہ نکاح سے مصالح خاصہ مقصود ہوتے ہیں۔ جس کے لیے کئی باتوں کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہوتا ہے نہ کہ صرف آباو اجداد کی طرف انتساب کو۔ اس سے بہت سی خرابیاں جنم لیتی ہیں جیسے بعض دفعہ مرد نالائق، بے دین یا مریض اور بیکار، یا بہت بوڑھا یا بالکل بچہ یا مالی لحاظ سے کمزور ہوتا ہے اور عورت کے لیے عمر بھر کا جیل خانہ یا پھانسی کا پھندا بن جاتا ہے۔

اسی طرح تفریطی کوتاہی بھی مفاسد کے لحاظ سے اس سے کم نہیں ہے۔ اس جدید دور میں بعض جدید تعلیم یافتہ لوگ یا حب دین یا حب دنیا سے مغلوب حضرات دوسری خوبیوں کے ہوتے ہوئے نسب کا ذرا بھی خیال نہیں رکھتے۔ ایسے نکاح میں بھی بہت سی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں جن سے بعض دفعہ نوبت طلاق تک پہنچ جاتی ہے۔ اور دو خاندانوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دشمنی اور عداوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اگرچہ ایسے مرد اور عورت کا نکاح تو شرعی طور پر ہو جاتا ہے، لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ عورت کی نظر میں خاوند کی کوئی وقعت نہیں ہوتی جس سے نکاح کی تمام مصلحتیں فوت ہو جاتی ہیں۔

اسلام نے اس بات کو بھی نہایت ضروری قرار دیا ہے کہ نکاح کرنے سے قبل زوجین سے ان کی مرضی معلوم کر لینی چاہیے، تاکہ نکاح کے بعد کی زندگی تلخیوں کی آماجگاہ نہ بن جائے۔ "نکاح سے قبل خاص طور پر لڑکے اور لڑکی کی رائے دریافت کی جائے جس کا اچھا طریقہ یہ ہے کہ جن سے وہ بے تکلف ہیں جیسے ہم عمر دوست اور سہیلیاں۔ ان کے ذریعہ سے، اس طور پر کہ ان کو یہ معلوم ہو کہ ہمارے بزرگ ہم سے دریافت کر رہے ہیں، ان کا مافی الضمیر معلوم کر لیا جائے اور تجربے کی بات ہے کہ اس طریقہ سے ان کے خیالات ضرور معلوم ہو جاتے ہیں اور بعض دفعہ تو بے دریافت کیے وہ خود ہی ایسے بے تکلف دوستوں سے اپنی پسندیدگی اور ناپسندیدگی ظاہر کر دیتے ہیں۔ اور بڑوں تک وہ

خبریں پہنچ جاتی ہیں۔ مگر ظلم و ستم یہ ہے کہ پھر بھی بعض مہمل موہوم مصلحتوں کو پیش نظر رکھ کر ان کے اس خیال کی پروا نہیں کی جاتی اور ان کو زبردستی اس بلا میں پھنسا دیا جاتا ہے۔ بہت دفعہ ایسے ہوا ہے کہ ناپسندیدگی کی حالت میں نکاح کر دیا گیا۔ پھر شوہر صاحب نے عمر بھر اس منکوحہ کی خبر نہیں لی اور فہمائش پر صاف جواب دے دیا کہ میں نے تو اپنی رائے ظاہر کر دی تھی، جنھوں نے اس کے باوجود بھی یہ عقد کیا ہے، اخراجات کے وہ ذمہ دار ہیں۔ (ایضاً، ج ۲، ص ۳۴)۔

"اب بتلایئے اس مصیبت کا کیا علاج؟ ان بوسیدہ عقل بزرگوں کی تو مصلحت ہوئی اور غریب مظلوم تمام عمر کے لیے قید غیر میعادی میں گرفتار ہوئی۔ کہاں ہیں یہ فرسودہ عقل؟ اب آئیں اور اس مظلومہ کی کچھ مدد کریں، مگر مدد کیا کرتے۔ اول تو اس وقت تک مرکھپ بھی گئے اور زندہ بھی رہ گئے تو ڈھیٹ پن تو دیکھیے، یہ کہہ کر صاف الگ ہو گئے کہ صاحب کوئی کسی کی قسمت میں تو گھس کر نہیں نکلا۔ ہم کیا کریں اس کی قسمت! ہائے غضب۔ کیا غضب کا جواب ہے، جس سے وہ مظلومہ تو درکنار، غیر آدمی کے تن بدن میں 'بشرطیکہ تھوڑا منصف ہو' آگ لگ جاتی ہے"۔ (ایضاً، ص ۴۳، ۳۵)

کتنے اچھے انداز میں مولانا اشرف علی تھانوی نے اس بات کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے کہ نکاح سے قبل مرد اور عورت سے جہاں ان کا نکاح ہو رہا ہے، ان کی رضامندی بھی ضروری ہے۔ اور اگر رضامندی کے خلاف ان میں سے کسی کا نکاح کر دیا گیا اور نکاح کے بعد مرد یا عورت کو غیر رضامندی کی وجہ سے کوئی تکلیف ہوئی تو بزرگ اس کے ذمہ دار ہوں گے اور وہ یہ کہہ کر اپنی جان نہیں چھڑا سکتے کہ تقدیر میں یہی لکھا ہوا تھا۔ اب اگر کوئی مرد اور عورت نکاح سے قبل ان کی رضامندی نہیں لیتا تو اس میں دین کا کوئی نقص نہیں، بلکہ ان لوگوں کی خرابی ہے جو اسلام کی روح سے ناآشنائی کے سبب ایسا کرتے ہیں (اخذ و ترتیب: مسلم سجاد)۔

خطوطِ مودودیؒ ایک تاثراتی مطالعہ

پروفیسر خورشید احمد

زیر نظر تجزیاتی مطالعہ 'پروفیسر خورشید احمد نے "خطوط مودودی" : ۲ (مرتبہ: رفیع الدین ہاشمی 'سلیم منصور خالد ' منشورات 'لاہور) کے حوالے سے رقم کیا ہے۔ اس طویل تجزیے کی پہلی قسط دی جارہی ہے (مدیر)۔

اردو ادب کی تاریخ چاہے اپنے سن و سال کے اعتبار سے 'عربی' فارسی اور خود انگریزی جیسی عالمی زبانوں سے کم ہی کیوں نہ ہو 'لیکن حقیقت یہ ہے کہ نوعمری کے باوجود اس کا دامن ہر صنف ادب کے بڑے قیمتی اور درخشاں خزانوں سے مالا مال ہے۔ نہ صرف نعت ' حمد 'غزل 'نظم 'گیت ' مثنوی ' داستان ' ناول ' افسانہ ' ڈراما ' مضمون ' مقالہ ' انشائیہ ' سفرنامہ اور طنز و مزاح ' بلکہ مکتوب نگاری کے میدان میں بھی ایک قیمتی اور روشن روایت نظر آتی ہے۔ اردو ادب ایک ایسا مکمل البم ہے ' جس میں فکر و فن کی ہر تصویر اپنے مقام پر موجود ہے۔

انسانی زندگی میں خط کا ایک بڑا ہی منفرد مقام ہے 'جس طرح زبان دوسرے انسانوں سے گفتگو کا ذریعہ ہے 'اسی طرح خط اپنوں اور غیروں سے قلمی گفتگو کا وسیلہ ہے۔ ایک طرف یہ انسانی تعلقات استوار اور مستحکم کرنے کا ذریعہ ہے ' دوسری طرف یہ ان تعلقات کی کمیت اور کیفیت کا آئینہ بھی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ بہ یک وقت فکر 'جذبات ' احساسات اور شخصیت کے اظہار کا ایک فطری مگر موثر آلہ ہے۔

خطوط کا بڑا حصہ انسانوں کے درمیان درجہ بدرجہ ربط و تعلق 'جذبات و احساسات اور افکار و معاملات کے اظہار کی فطری اور حقیقی ضرورتوں کا پیدا کردہ ہے۔ ان کے ذریعے ذاتی تعلقات 'فکری مباحث 'کاروباری معاملات 'معاشرتی و ثقافتی روابط استوار کیے جاتے ہیں۔ یہ مقصد اور مدعا کے اظہار کا ذریعہ ہیں اور جذبات کی تسکین کا وسیلہ بھی۔ اردو کے خزینہ مکتوبات پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں زندگی کے تمام ہی پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس آئینے میں خانگی کیفیات ' اور عشق و محبت کے جذبات سے لے کر فلسفیانہ امور ' ادبی نکات اور عالمی اور ملکی مسائل سب کا عکس دیکھا جاسکتا ہے۔ بلاشبہ کچھ خطوط وہ بھی ہیں جو بالکل ذاتی اور خانگی ہیں 'جن کی اصل حیثیت "ذاتی امانت" کی سی

ہے' اور جو دو افراد کے درمیان سرگوشی سے عبارت ہیں۔ ان کے لکھنے والے کے ذہن کے کسی گوشے میں بھی یہ خیال نہ تھا کہ یہ خط شائع ہوں گے اور اس طرح ایک تیسرا شخص بھی اس نجی محفل میں در آئے گا۔

اسی طرح کچھ خط ایسے بھی ہیں جو لکھے ہی گئے ہیں چھپوانے کے خیال سے' بلکہ ایسا بھی ہوا ہے کہ کچھ خطوط مکتوب الیہ کو بھی حسن طباعت سے آراستہ ہونے کے بعد ہی ملے ہیں[۱]۔ پھر ایسے خطوط بھی ہیں جن کا مکتوب الیہ خیالی ہے۔ ایسے بے نام خطوط کا مقصد کسی متعین شخص سے گفتگو نہیں بلکہ یا وہ خود کلامی کا ایک ذریعہ ہیں یا محض اظہار مدعا کا ایک اسلوب[۲]۔ ادب کا دامن ان خطوط سے بھی خالی نہیں جن کے بارے میں غالب نے کہا تھا[۳]

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو ہم تو عاشق ہیں تمھارے نام کے

ادب کی کہکشاں میں ان سب کا اپنا مقام ہے' لیکن جو خطوط مکاتیبی ادب کو فکر و فن دونوں کے اعتبار سے ایک قیمتی سرمایہ بناتے ہیں' وہ ہیں جن میں سوز دل اور غم جاناں کے ساتھ مسائل حیات اور غم روزگار سے بھرپور تعرض کیا گیا ہے۔ یہ مکاتیب فکری مسائل' نظریاتی مباحث اور قومی و اجتماعی معاملات کی تفہیم کا مرقع ہیں' اور یہی ان کی منفرد شان ہے۔ اگر مکاتیب کا یہ خزانہ اردو ادب کا حصہ نہ ہوتا تو دنیائے علم و ادب اپنی غربت کا نوحہ کرتی اور آنے والی نسلیں اپنے تہذیبی اور سیاسی ورثے کے بڑے قیمتی حصے سے محروم ہو جاتیں۔

مرزا اسد اللہ خاں غالب (ف ۱۸۶۹) جس طرح اردو غزل کے امام ہیں اور ان کا دیوان ایک تاریخ ادب اردو میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ شاعری کی طرح غالب کے خطوط بھی مکتوب نگاری کے باب میں ایک نئے دور کے باب کشا ہیں۔ دیوان غالب مرتب اور محفوظ نہ ہوتا جب بھی غالب کے خطوط ان کے مقام رفیع کی ضمانت کے لیے کافی تھے۔ کہا جا سکتا ہے غالب نے اردو ادب کو جن بلندیوں اور وسعتوں سے ہم کنار کیا' اس میں ان کے کلام کے ساتھ ان کے مکاتیب کا بھی نمایاں حصہ ہے' اور خود کلام غالب کی شرح و توضیح میں بھی ان خطوں کا ایک اہم رول ہے۔ غالب کے بعد خطوط نگاری کی جس روایت پر ہم گفتگو کر رہے ہیں' اس کی آبیاری اور تزئین میں جن اہل علم و ادب نے نمایاں حصہ لیا' ان میں سرسید احمد خاں' الطاف حسین حالی' شبلی نعمانی' ابوالکلام آزاد' علامہ محمد اقبال' مولوی عبدالحق' مہدی افادی' سید سلیمان ندوی' عبدالماجد دریا بادی' نیاز فتح پوری' فراق گورکھپوری' رشید احمد صدیقی' مولانا حسین احمد مدنی' خواجہ حسن نظامی وغیرہم قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا گیسوئے اردو سنوارنے اور آبروئے علم و فن کو چار چاند لگانے میں اپنا اپنا حصہ ہے' مگر مکتوباتی ادب میں سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (۱۹۰۳-۱۹۷۹) کے خطوط کی ایک منفرد شان ہے۔ علم و

ادب کی اس کہکشاں میں وہ سب کے ساتھ بھی ہیں اور سب سے الگ بھی ؎

آفاق ہا گردیدہ ام مہرِ بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی علمی و ادبی زندگی کا آغاز پہلی جنگ عظیم (۱۸-۱۹۱۴) کے بعد ہوتا ہے اور یہ آفتاب علم و ادب ۱۹۷۹ تک ضوفشانی کرتا رہا۔ تقریباً ساٹھ سال پر محیط اس عرصے میں سید مودودی نے ہزاروں افراد سے اور ہزارہا موضوعات پر قلمی گفتگو کی ہے۔ اس میں اہل خانہ، قریبی دوست و احباب، تحریکی ساتھی، سیاسی ناقد، مشاہیر علم و ادب اور گم نام سائل، سب ہی سے ان کا قلمی ربط رہا ہے۔ ان کے خطوط کی تعداد کا اندازہ کرنا مشکل ہے، لیکن غالباً یہ کہنا مبالغہ نہ ہو گا کہ ان کے مکتوبات کی تعداد پچاس ساٹھ ہزار کے درمیان ہوگی۔ یہ ایک سانحہ ہے کہ اس قیمتی خزانے کا بڑا حصہ ضائع ہو گیا یا دستیاب نہیں۔ اب تک جو مجموعے شائع ہو چکے ہیں، ان میں خالص علمی اور تحریکی امور سے متعلق خطوط کی پانچ جلدیں "رسائل و مسائل" کے نام سے آچکی ہیں۔ ان کے علاوہ مولانا مودودی کے خطوط کے آٹھ مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ ان ۱۳ جلدوں میں کئی ہزار خطوط شامل ہیں اور ابھی ہزاروں کی تعداد میں قیمتی موتی اور جواہر پارے گوشہ خمول میں ہیں جن کی تلاش، ترتیب اور طباعت ان کے معنوی فرزندوں پر قرض ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ برادران عزیز ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اور سلیم منصور خالد نے ان جواہر کو جمع کرنے اور اہلِ علم و ادب تک ان کو پہنچانے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ ۱۹۸۳ میں "خطوطِ مودودی" کی پہلی جلد ان کی مساعی کے نتیجے میں سامنے آئی، جس میں مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کے نام مولانا مودودی کے بڑے قیمتی اور تحریکی اعتبار سے بے حد اہم خطوط شائع کیے گئے۔ اب ۱۹۹۵ میں خطوطِ مودودی کی دوسری جلد زیورِ طباعت سے آراستہ ہوئی ہے۔ اس مجموعے میں مولانا محترم کے ایک سو پچاس خط ہیں، جو ۱۹۲۰ سے لے کر ۱۹۷۹ کے عرصے میں لکھے گئے۔ ان خطوط کو بڑے سلیقے سے مرتب کیا گیا ہے۔ بڑی محنت اور عرق ریزی سے ہر خط کا ابتدائیہ اور حواشی لکھے گئے ہیں، جن کے ذریعے وہ تمام معلومات فراہم کی گئی ہیں، جو قاری کو ان تمام نکات اور اشاروں اور کنایوں کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں جو خطوط میں مضمر ہیں۔ ان معلوماتی اضافوں میں اس پس منظر اور ماحول کو نمایاں کیا گیا ہے جس میں خط لکھا گیا، اور ان ماخذ کی نشاندہی کی گئی ہے جہاں سے مزید معلومات حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس عظیم ادارتی خدمت نے اس مجموعے کی اہمیت اور افادیت میں بڑا اضافہ کیا ہے اور اس کو باقی تمام مجموعوں سے واضح طور پر منفرد کر دیا ہے[۲]۔

مولانا مودودی کے خطوط مقصدی مکتوب نگاری کی بہترین مثال ہیں۔ ان خطوں میں ان کے

ذاتی تعلق 'گھریلو حالات اور قلبی کیفیات کا ذکر بھی آتا ہے ' لیکن بہ تقاضائے فطرت اور بہ قدر ضرورت ۔ بلاشبہ مضمون اور خط کا اصل فرق ہی خط کے ذاتی رنگ اور واحد متکلم کی کیفیت میں ہے ۔ خط میں جذبات و احساسات کی آویزش تحریر کو اس کا اصل آہنگ دیتی ہے ' ورنہ اگر خط میں صرف مضمون اور مقالے کی فضا ہو تو وہ خط نہیں کچھ اور ہے ۔ بلکہ یہ کہنا بھی غلط نہیں ہو گا کہ اگرچہ مصنوعی خط نگاری بھی شخصیت کا ایک مظہر ہے ' لیکن یہ اعجاز ایک عام اور سیدھے سادے خط ہی کا ہے کہ وہ مکتوب نگار کی شخصیت کا ایک بے لاگ آئینہ ہوتا ہے ۔ اس میں لکھنے والے کے خیالات اور علم و ادب ہی کا پرتو نہیں دیکھا جاتا ' بلکہ وہ اس کی شخصیت اور مزاج کے بہت سے پہلوؤں کا عکاس ہوتا ہے ۔ اس کسوٹی پر مولانا کے خطوط پارس نظر آتے ہیں ۔

مولانا مودودی کی زندگی کے ہمہ جہت ' مسائل ' مصائب ' کشمکش اور بہت سے دوسرے پہلو خطوط کے اس آئینے میں صاف دیکھے جا سکتے ہیں ۔ ان خطوط میں ذاتی جذبات اور احساسات کی حرارت کے ساتھ ساتھ زندگی کے ہزاروں مسائل پر سوچی سمجھی آرا کا اظہار کیا گیا ہے ۔ ان میں بیماریوں کا ذکر ہے ' حکیم ڈاکٹر سے مشوروں کی بات ہے ' دوستوں سے شکوہ شکایت بھی موجود ہے ' عدیم الفرصتی کا نوحہ ہے 'ملت کی زبوں حالی کا تذکرہ ہے ' مستقبل کے عزائم کا اظہار ہے ' سوز دروں اور روح کی بے چینی کی جھلکیاں ہیں ' دین اور سیاست پر گفتگو ہے ' فلسفہ اور ادب پر اظہار خیال ہے 'تحریکی مسائل پر بحث ہے ' معترضین سے مجادلہ و مکالمہ ہے ' ارباب اقتدار کا احتساب ہے اور وقت کے اہم مسائل پر سادگی اور صفائی کے ساتھ نقد و تبصرہ ہے ۔ تحریر میں بلا کی روانی اور جملے جملے میں ادبی حسن ہے ۔ کہیں بھی مصنوعی طور پر بیان میں رنگینی اور ادبی چاشنی پیدا کرنے کا کوئی شائبہ تک نظر نہیں آتا ۔ وہ اپنے مکتوب میں ہر جگہ سادگی اور صفائی لیکن پورے اعتماد اور قدرت کے ساتھ اپنی بات کو واضح کرتے ہیں ' اور حشو و زوائد سے کلی اجتناب کرتے ہیں ۔ مکتوب نگار کی دلچسپی اظہار مدعا سے ہے ' محض ادب طرازی سے نہیں ۔ طرز بیان میں سادگی ' بے تکلفی اور برجستگی بدرجہ اتم ہے ۔ زبان و بیان میں صحت اور حسن عبارت کا پورا اہتمام ہے ' لیکن لفاظی اور قافیہ آرائی سے مکمل احتراز ۔

مولانا مودودی کے اسلوب کا ایک اہم پہلو یہ نظر آتا ہے کہ وہ بس ضرورت کے تحت خط لکھتے ہیں ۔ خط ضرورت ہی کے مطابق مختصر یا طویل ہوتا ہے ' اور اصل ہدف بس یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے مدعا کو صاف صاف لفظوں میں بیان کر دیں 'مگر اس انداز میں کہ بات پڑھنے کے قابل ہو اور پڑھنے والے کے لیے دلچسپ و دل نشیں ۔ ان کی تحریر کی یہ خوبی ہے کہ نہ لکھنے والے کو یہ شکایت ہوتی ہے اور نہ پڑھنے والے کو کہ ''مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا'' ۔ یہ چیز مولانا مودودی کے خطوط کو نامور دینی عالموں ' مشاہیر اور مبلغین کے خطوط سے ممیز و ممتاز کرتی ہے ۔ ان کا اسلوب جدید اور ان کی زبان

سادہ اور سلیس ہے، ان کی عبارت صحت بیان کے ساتھ ساتھ ادبی حسن اور برجستگی سے آراستہ اور پر اثر ہے۔ انداز بیان منطقی اور مدلل ہے۔ بات دل اور دماغ دونوں کو اپیل کرتی ہے۔ کہیں کہیں ان کے قلم کی شوخی، ظرافت و بذلہ سنجی (wit) کا ایسا نمونہ دکھلاتی ہے کہ قاری دیر تک لطف لیتا رہتا ہے۔ غرض مولانا مودودی کے خطوط ان کی بوقلموں شخصیت کا آئینہ اور ان کے افکار اور احساسات کے سچے ترجمان ہیں۔

ان خطوط کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ مکتوب نگار کا فکر و فن ان کی ہر سطر میں بوئے گل کی طرح موجود ہے اور مخفی بھی۔ مولانا کے خط ان کی شخصیت کے گرد گردش نہیں کرتے اور نہ شخصیت کو ابھارنے اور بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ ان پر اسلام، دعوت اسلامی، تحریک اسلامی اور ملت اسلامیہ کا رنگ غالب ہے۔ موجودہ مجموعے میں برعظیم پاک و ہند میں اسلامی دعوت اور ملت اسلامیہ کی تاریخ کے نشیب و فراز کی تصویر دیکھی جا سکتی ہے، اور اس جدوجہد کا عکس بھی جو دور حاضر کے چیلنجوں کے مقابلے کے لیے اسلام کے خادموں نے کی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس کی وجہ سے خطوط مودودی کا موجودہ مرقع اگر ایک طرف سید مودودی کی شخصیت اور ان کے مشن کو سمجھنے کا ایک اہم ذریعہ ہیں، تو دوسری طرف عصر حاضر میں اسلامی تحریک اور اس کی جدوجہد کی بہتر تفہیم کا ایک اہم وسیلہ ہے۔ ان خطوں کے مطالعہ سے اسلام کے پیغام کی عظمت دل و دماغ پر مرتسم ہوتی ہے اور لکھنے والے کے لیے دل میں احساس ممنونیت پیدا ہوتا ہے۔ وقت کے مسائل پر مولانا کی گرفت اور دنیا کے اصول و اقدار پر ان کے اعتماد کا نقش دل پر اور گہرا ہو جاتا ہے۔

ان خطوط کے مطالعے سے مولانا مودودی کی جو تصویر ابھرتی ہے، وہ محض ایک فلسفی، مفکر، متکلم یا سیاست دان کی نہیں، بلکہ باعمل عالم اور ایک داعی الی الخیر کی تصویر ہے، جو دنیا کی ہر چیز کو اپنے مقصد پر قربان کر دینا چاہتا ہے۔ جو انسانیت کی زبوں حالی پر متفکر اور مسلمانوں کی تہی دامانی پر مغموم ہے۔ جو اسلام کے عالمی کردار پر پختہ یقین رکھتا ہے، اور اس کی روشنی میں ایک نئی دنیا تعمیر کرنے کے لیے جسم و جاں کی بازی لگانے کے لیے سرگرم ہے، جو غفلت میں گم امت مسلمہ کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بیدار کر رہا ہے، جو راہ حق کے لیے ساتھیوں کا متلاشی ہے اور ہر طالب خیر کو اس جدوجہد میں شریک کرنے کے لیے بے چین ہے۔ آپ ان خطوں میں یہ سارے مناظر دیکھ سکتے ہیں۔ دوران مطالعہ آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ اس راہ دعوت و عزیمت کے ہر موڑ، ہر مرحلے، ہر مشکل اور ہر آزمائش کے بارے میں سید مودودی کے تاثرات کیا ہیں؟ اور کس طرح وہ خود بھی ان آزمائشوں کا مقابلہ کرنے کے لیے سینہ سپر ہیں، اور وہ چاہتے ہیں کہ سب سعید روحیں جہاد زندگانی کے اس کارزار میں شریک ہو جائیں۔ ○

ایک دل ہے اور طوفان حوادث اے جگر ایک شیشہ ہے کہ ہر پتھر سے ٹکراتا ہوں میں

اوپر کے صفحات میں مولانا کے خطوط کی خصوصیات کا جو تجزیہ میں نے کیا ہے، آئیے اب اس مجموعے کے خطوط سے ان کی کچھ مثالیں دیکھیں، تاکہ دعوے کا ثبوت بھی آپ کے سامنے آسکے سب سے پہلے چند جھلکیاں مکتوب نگار کی شخصیت کی دیکھ لیجیے:

شخصیت و کردار کا حسن

مولانا مرحوم کے بارے میں بہت سے حضرات کا خیال ہے کہ وہ غیرجذباتی اور ذاتی تعلقات کے سلسلے میں سرد مزاج تھے، لیکن ان کی شخصیت کے بارے میں یہ بڑا ہی سطحی اندازہ ہے۔ جو افراد ان کے قریب رہے ہیں، وہ گواہی دیں گے کہ غیرجذباتی طبیعت کا یہ تاثر، ان کی مضبوط قوت ارادی کی وجہ سے بنتا تھا، جو جذبات کے مدوجزر کو لگام دیے رکھتی تھی۔ ورنہ وہ جذبات سے بھرپور دل اور اپنے ساتھیوں کے لیے شفیق اور مجسم رحمت و محبت تھے۔ ذاتی تعلقات کو درجہ بہ درجہ نبھانا انھی کا حصہ تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جماعت اسلامی پر پابندی (جنوری ۱۹۶۴) عائد ہونے کے بعد، مارچ میں لاہور سنٹرل جیل میں جماعت کی مجلس شوریٰ کے تمام ارکان جمع کیے گئے تھے، رات کو بارش کی جھڑی لگی اور ہم میں سے بیشتر افراد باہر خیموں میں تھے، تو مولانا نے ساری رات بے چینی میں ٹہل کر گزاری اور ایک ایک ساتھی کے لیے متفکر رہے۔ ہم میں سے جو بیمار ہوئے ان کی تیمارداری خود اپنے ہاتھوں سے کی۔ ان خطوط میں بھی جگہ جگہ مولانا کی باطنی کیفیات کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔

ایک طرف فطری انسانی جذبات کا وفور ہے تو دوسری طرف مضبوط قوت ارادی کے ذریعہ ان کا ضبط، سید مودودی کے کردار کا یہ حسن، حیدر آباد، دکن سے ہجرت کرتے وقت چودھری نیاز علی خاں کے نام ایک خط میں چھلک پڑتا ہے:

"اب مجھے محسوس ہونا شروع ہوا ہے کہ ہجرت کیسی سخت چیز ہے۔ باوجودیکہ حیدر آباد میرا وطن نہیں ہے اور میں یہاں سے کسی مصیبت اور بے سروسامانی کی حالت میں نہیں نکل رہا ہوں، مگر پھر بھی ایک عجیب قسم کی تکلیف اپنے قلب میں محسوس کر رہا ہوں۔ جس مکان میں برسوں رہا ہوں، جن چیزوں کو شوق سے خرید اور بنوایا تھا، وہ سب ہروقت سامنے کھڑی فریاد کرتی رہتی ہیں کہ تو ہمیں کہاں چھوڑے جا رہا ہے۔ اگرچہ اپنی قوت ارادی سے کام لے کر اس کیفیت کو دبا رہا ہوں، مگر فطری جذبات تو اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہتے"۔ (خطوط مودودی ج ۲، ص ۱۴۱-۱۴۳)

پروفیسر فروغ احمد، جماعت کے پرانے کارکن اور قریبی ساتھی تھے۔ جب بنگلہ دیش (سابق مشرقی پاکستان) سے ان کی خیریت کی پہلی اطلاع آتی ہے، مولانا کے جذبات پھوٹ پڑتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"معلوم کر کے کہ آپ بخیریت ہیں' اتنی خوشی ہوئی کہ عید کی خوشی بھی اس کے مقابلے میں کم ہی ہوگی۔ جو رفقا وہاں رہ گئے ہیں' خصوصاً غیر بنگالی رفقا' ان کے متعلق ہمیں تو ایک طرح سے مایوسی ہو چلی تھی کہ اب کبھی اس زندگی میں ان سے ملنا ہو بھی سکے گا یا نہیں۔ایک ایک آدمی کا خیال آتا ہے اور سوچتا ہوں کہ نہ معلوم وہ زندہ بھی ہیں یا نہیں۔اللہ کا سراسر احسان ہے کہ آپ اس جہنم زار میں بخیر ہیں۔وہاں سے آپ کے نکلنے کی جو صورت بھی ممکن ہو' وہ ہمیں بتائیں۔لندن میں ایسے ہمدرد موجود ہیں' جو اس کام میں ہر طرح کی مالی مدد کرنے کے لیے تیار ہیں۔وہاں سے یہاں براہ راست آنے کی بہ نسبت لندن جاکر آنا زیادہ آسان ہے"۔(ایضاً، ص ۲۹۸-۲۹۹)

نذیر احمد قریشی' مولانا محترم کے نہایت قریبی اور بے تکلف دوست تھے' ان کے نام خط سے اپنے کام کی وہ لگن جھلکتی ہے جو ان کی قوت ارادی کا منبع تھی' اور اظہار جذبات کی فرصت دینے میں بھی مانع:

"خط ماشاء اللہ خاصا طویل ہے' تاہم میں نے ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا' اور دوسری نشست کو آپ کے لیے وقف کرتا ہوں۔یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ دوسرا' جواب سے "گریز" کرتا ہے۔ پھر بھی خط لکھنا اور جواب کی پروا کیے بغیر لکھنے پر تلے رہنا' اخلاقی "کمزوری" نہیں بلکہ بڑی زورآوری ہے' جس کو اصطلاح و محاورہ میں "ہیکڑی" بھی کہتے ہیں' مگر آپ یقین کیجیے کہ میں جواب دینے سے "گریز" نہیں کرتا' بلکہ جواب دینے کی فرصت مجھ سے گریز کرتی ہے۔اگر خدا مجھے عمر نوح عطا کرتا تو یقیناً میں ایک صدی تو ضرور دوستوں سے لطف گفت و شنید حاصل کرنے میں گزار دیتا۔مگر یہاں تو حد سے حد چھلانگ ماری تو ۶۰ سے آگے جانے کی امید نہیں ہے۔اس لیے کام کرنے کی ہوس بڑھتی ہوئی ہے اور بڑھتی جا رہی ہے اور اس کی بدولت اتنے جھنجٹ جان کو لگ گئے ہیں کہ اللہ ہی ان سے عہدہ برآ کر سکتا ہے"۔(ایضاً، ص ۳۰-۳۱)

اپنی والدہ سے والہانہ محبت کے تعلق اور ان کے ملکوتی حسن کردار کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار ایک خط میں اس طرح کرتے ہیں کہ اس آئینے میں خود ان کی شخصیت بھی جھلک رہی ہے:

"آپ کا عنایت نامہ ملا۔آپ کی فرمایش نے میرے دل کے اس زخم کو پھر تازہ کر دیا جو اپنی والدہ ماجدہ مرحومہ کی وفات سے اس کو لگا تھا۔اگرچہ اب ان کو دنیا سے رخصت ہوئے کئی سال ہو گئے' مگر جب کبھی ان کا ذکر آ جاتا ہے دل تڑپ اٹھتا ہے۔ان کی خوبیاں ایسی تھیں کہ ان کی اپنی اولاد تو کجا' ان کے دور دراز کے رشتہ دار اور ان سے ملنے والی خواتین تک ان کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔نہایت ملنسار' ہر ایک سے محبت کے ساتھ ملنے والی' ہر ایک کے دکھ درد میں شریک۔ اپنے عزیزوں کے سوا ان گنت خواتین ہیں جن کو انھوں نے بہن یا بیٹی بنا رکھا تھا اور ان سے رشتہ داروں ہی

کا سا سلوک فرماتی تھیں۔ فیاضی کا یہ حال کہ پیسہ ان کو گویا کاٹتا تھا۔ جو کچھ بھی ان کے پاس ہوتا' حاجت مندوں کی مدد اور مہمانوں کی تواضع پر خرچ کر کے خالی ہاتھ رہ جاتی تھیں۔ زندگی بالکل فقیرانہ تھی۔ موٹا جھوٹا اور پیوند لگا ہوا لباس رغبت سے پہنتی تھیں اور جو نیا لباس ان کے لیے بنایا جاتا اسے کسی نہ کسی کو عطا کر دیتی تھیں۔ کھانے پینے میں بھی ان کا یہی حال تھا۔ اچھے سے اچھا دوسروں کو کھلاتیں اور برے سے برا خود کھاتیں۔ اکثر ایسا ہوتا کہ گھر والوں اور باہر سے آئے ہوئے مہمانوں کو کھانا کھلانے کے بعد خود پتیلی پونچھ کر روٹی کھایا کرتی تھیں۔ خاکساری کا یہ حال تھا کہ غریب سے غریب لوگوں کو بہن اور بیٹی بنا کر انھی کے ساتھ بیٹھا کرتیں اور امیروں کی طرف زیادہ توجہ نہ کرتیں۔ محلّے کی غریب عورتیں ہر وقت ان کو گھیرے رہتیں۔ قرآن پڑھانے کا بے حد شوق تھا' جہاں رہتیں آس پاس کی بچیوں کو جمع کر لیتیں اور انھیں قرآن پڑھاتی رہتیں۔ نہایت زاہد و عابد' ذاکر و شاغل تھیں' لیکن کبھی انھوں نے نہ زہد و تقویٰ کا لوگوں کے سامنے مظاہرہ کیا' نہ اس پر فخر کا ادنیٰ شائبہ تک ان کی زندگی میں کبھی پایا گیا۔ میرے ساتھ بے انتہا محبت کرتی تھیں' مگر بچپن سے انھوں نے یہ طرزِ عمل رکھا کہ کوئی بری بات یا کوئی غلط کام کرتے دیکھتیں تو فوراً تنبیہہ کرتیں اور بے جا محبت سے اولاد کو بگاڑنا ان کو اتنا ناپسند تھا کہ دوستوں کو بھی بے جا لاڈ پیار کرتے دیکھ کر اس سے منع کرتی تھیں۔ میرے بس میں نہیں ہے کہ ان کی تعریف کا حق ادا کر سکوں۔ ہمیشہ دعا کرتا ہوں کہ جس محبت سے انھوں نے مجھے پالا اور جس تربیت سے انھوں نے میری زندگی کو سنوارا' اس پر اللہ تعالیٰ انھیں بے حد و حساب اجر عطا فرمائے"۔ (ایضاً' ص ۵۱۵۔۵۱۶)

ایسی ماؤں کا وجود اسلام کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ سید مودودی جیسے انسان ایسی ہی ماؤں کی تربیت کا حاصل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ماں کی فطرت میں خیر رکھا ہے' لیکن اسلام نے اس خیر کو جلا بخشی اور ماں کی گود اور اس کی پرورش کے ذریعے ایمان' اخلاق' تہذیب اور کردار کو پروان چڑھانے کے باب میں وہ کارنامہ سرانجام دیا جس کی نظیر کسی دوسری تہذیب و ثقافت میں نہیں ملتی۔ آج اسلام دشمن قوتوں کا سب سے اہم ہدف ماں کی اس گود سے نئی نسلوں کو محروم کر دینا ہے اور اس شیرِ مادر کو مسموم کر دینا ہے جو ایمان اور تہذیب کی غذا رہا ہے۔

اپنی ہم عصر محترم شخصیات کے ساتھ سید مودودی نے جس طرح' بعض اوقات اختلاف رائے کے باوجود' اکرام و مدارات' احترام و یگانگت اور اعتراف و انصاف کے تعلقات رکھے' یہ چیز ان کی شخصیت کا ایک اور حسین پہلو ہے۔

برعظیم پاک و ہند میں مسلمانوں کی آزادی اور قیام پاکستان کے لیے قائداعظم کی بے لوث خدمات ہماری تاریخ کا ایک درخشاں باب ہے۔ قائداعظم کے بارے میں مدیر نوائے وقت مجید نظامی

کے نام اپنے ایک خط میں مولانا مودودی اپنے جذبات کا یوں اظہار کرتے ہیں:

"آپ کی معلومات کے لیے اتنا کہنا کافی سمجھتا ہوں کہ ہوش سنبھالنے کے بعد جب سے میں نے ملکی سیاست میں دلچسپی لینی شروع کی تھی، میرے دل میں مسلمانوں کے جن لیڈروں کا احترام سب سے زیادہ تھا، ان میں ایک قائداعظم مرحوم بھی تھے، میں نے ہمیشہ ان کو ایک بااصول، راست باز اور مضبوط سیرت وکردار کا مالک انسان سمجھا اور ۱۹۲۰ سے ۱۹۴۸ تک کبھی میرے دل میں ان کے متعلق یہ بدگمانی پیدا نہیں ہوئی کہ وہ اپنے ضمیر کے خلاف بھی کوئی بات کہہ سکتے ہیں۔ قائداعظم مرحوم کے متعلق مجھے کبھی یہ شبہ نہیں ہوا کہ وہ پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کے معاملے میں مخلص نہ تھے، البتہ ان کے "پس ماندگان" کے متعلق مجھے یہ شبہ ضرور ہے کہ وہ ان کی ہم نوائی میں مخلص نہ تھے اور یہ شبہ ان حضرات کے ان اعمال کی بنا پر ہے جو اقتدار حاصل کرنے کے بعد وہ کرتے رہے"۔ (ایضاً، ص ۴۴۳)

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ سے سید مودودیؒ کے قریبی تعلقات تھے اور مولانا موصوف بھی سید مودودی پر بڑی شفقت فرماتے تھے۔ سید مودودی نے برعظیم کے تمام چوٹی کے علما کو تحریک اسلامی میں شرکت اور اس کی راہ نمائی کی دعوت دی۔ جواب میں نحن انصار اللہ کی جگہ اعتراضات اور طعن وتشنیع کی بوچھاڑ ہوگئی۔ مولانا گیلانی نے بھی اس پس منظر میں کچھ اپنے اور زیادہ دوسروں کے جذبات واحساسات کا اظہار فرمایا تو نوجوان داعی کا پیمانہ صبر کچھ چھلک سا گیا، بے چین ہوکر لکھتے ہیں:

"میں اپنے ان الفاظ پر بہ ادب معافی چاہتا ہوں جو میں نے پچھلے عریضہ میں لکھے تھے۔ اللہ علیم ہے کہ میری نیت ہرگز تحقیر کی نہ تھی۔ میں اس قسم کی باتیں صرف تحریض کی نیت سے لکھا کرتا ہوں۔ جو جذبہ مجھے کبھی کبھی حد ادب سے آگے بڑھا لے جاتا ہے وہ یہ ہے کہ آپ جیسے صاحب بصیرت اور صاحب دل حضرات کو میری آنکھیں مقدمۃ الجیش میں بلکہ اس سے بھی آگے دیکھنا چاہتی ہیں۔ یہ کام جسے مجھ جیسے ایک کم مایہ آدمی نے سنبھالا ہے، آپ جیسے لوگوں کے کرنے کا تھا اور میرا کام یہ تھا کہ میں آپ لوگوں کی رکاب تھام کر چلتا۔ خدا کی قسم، میرے دل میں نہ کبھی اس بات پر فخر پیدا ہوا کہ میں نے اس کام کو سنبھالا ہے، اور نہ کبھی یہ غلط فہمی ہوئی کہ میں اس کی سربراہی کا اہل ہوں۔ مجھے تو ہمیشہ اس بات کا افسوس ہوتا ہے کہ یہ جن کے کرنے کا کام تھا، وہ اپنے مرتبے سے فروتر کاموں میں مشغول ہیں اور مجھے اپنی فرومائیگی کے باوجود اس کار خطیر کی ذمہ داری اٹھانی پڑی ہے۔ یہی چیز جب مجھے اندر سے کاٹتی ہے تو میں بزرگوں کی شان میں اس قسم کی باتیں کہہ گزرتا ہوں جن کی آپ نے شکایت فرمائی ہے۔ لوگ گمان کرتے ہیں کہ میں اپنے آپ کو بڑا سمجھنے لگا ہوں اور بزرگوں کے منہ آتا ہوں، حالانکہ دراصل میں اپنے آپ کو چھوٹا ہی سمجھتا ہوں اور جب بڑوں کی خالی چھوڑی ہوئی جگہ پر

مجبوراً مجھے کھڑا ہونا پڑتا ہے تو میرے دل کو تکلیف ہوتی ہے اور کبھی کبھی جلے دل سے تلخ باتیں کہہ جاتا ہوں کہ ایک چھوٹے کا طعنہ سن کر ہی وہ کسی طرح اپنے اصل مقام پر آ کر کھڑے تو ہوں''۔ (ایضاً ' ص ۲۷۹-۲۸۰)

علامہ اقبال وہ شخصیت ہیں ' جن سے مولانا کا صرف علمی اور ذہنی تعلق ہی نہیں ' بلکہ بڑا گہرا جذباتی اور تحریکی تعلق بھی نمایاں ہو کر ابھرتا ہے ۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ ۲۰ویں صدی میں جن افراد نے اسلامی فکر اور احیائے اسلام کی عملی تحریک کی اپنے خون جگر سے آبیاری کی ہے ' ان میں علامہ اقبال اور سید مودودی کا حصہ سب سے نمایاں ہے ۔ وہ خط علامہ اقبال کی وفات پر مولانا کے جذبات اور احساسات کا مرقع ہے ' جو انھوں نے نذیر نیازی صاحب کو لکھا:

''میں اپنے وعدے کے مطابق آنے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ یکایک علامہ کے انتقال کی خبر پہنچی ۔ دفعتہ دل بیٹھ گیا ۔ سب سے زیادہ رنج مجھے اس بنا پر ہوا کہ کتنا قیمتی موقع میں نے کھو دیا ۔ آپ کے عنایت نامے سے مجھے صحیح اندازہ نہ ہو سکا تھا کہ وقت اس قدر قریب آ گیا ہے ۔ اگر معلوم ہوتا تو سب کام چھوڑ کر فوراً پہنچتا ۔ میں اس کو اپنی انتہائی بدنصیبی سمجھتا ہوں کہ اس شخص کی آخری زیارت سے محروم رہ گیا ' جس کا مثل شاید اب ہماری آنکھیں نہ دیکھ سکیں گی ۔

محمد علی [جوہر] کے بعد یہ دوسرا نقصان عظیم مسلمانوں کو پہنچا ہے ' اور یہ نقصان میری نگاہ میں پہلے نقصان سے عظیم تر ہے ۔ کچھ خبر نہیں کہ اللہ کو کیا منظور ہے ۔ بظاہر تو ہم یہ سمجھ رہے ہیں کہ مسلمان قوم کو اس کی ناقدری و نااہلی کی سزا دی جا رہی ہے کہ اس کے بہترین آدمی عین اس وقت پر اٹھا لیے جاتے ہیں جب ان کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے ۔ اب سارے ہندوستان پر نگاہ ڈالتا ہوں تو کوئی ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آتا جس کی طرف ہدایت حاصل کرنے کے لیے رجوع کیا جا سکے ۔ ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی ہے ۔ ایک شمع جو ٹمٹما رہی تھی وہ بھی اٹھا لی گئی ۔

مجھے جو چیز پنجاب کھینچ کر لائی تھی وہ دراصل اقبال ہی کی ذات تھی ۔ میں اس خیال سے یہاں آیا تھا کہ ان سے قریب رہ کر ہدایت حاصل کروں گا ' اور ان کی رہنمائی میں جو کچھ مجھ سے ہو سکے گا اسلام اور مسلمانوں کے لیے کروں گا ۔ اب میں ایسا محسوس کر رہا ہوں کہ اس طوفانی سمندر میں بالکل تنہا رہ گیا ہوں ۔ دل شکستگی اپنی آخری حد کو پہنچ گئی ہے ۔ صرف اس خیال سے اپنے دل کو ڈھارس دے رہا ہوں کہ اقبال مر گئے تو کیا ہوا ' خدا تو موجود ہے ۔ سب مر جانے والے ہیں ' زندہ رہنے والا وہی حی و قیوم ہے ۔ اور اگر وہ تجھ سے کوئی کام لینا چاہے گا تو تیری مدد کے لیے اور کچھ سامان کرے گا

برادرم ' آپ آخر وقت تک علامہ کے ساتھ رہے ہیں ۔ اگر میری ہدایت کے لیے انھوں نے کچھ فرمایا ہو تو مجھے ضرور اس سے مطلع کریں''۔ (ایضاً ' ص ۱۸۹-۱۹۱)

لیکن مولانا کے گہرے قلبی تعلق کا اظہار اس ایک جملہ میں ہوتا ہے، جو اس خط میں مابعد تحریر کرتے ہیں:

"میں چاہتا ہوں کہ ان کے پسماندگان کو تعزیت کا خط لکھوں۔ مگر پھر خیال آیا کہ ان کے پسماندے تو ہم سب ہیں، اور ہم سب تعزیت کے مستحق ہیں"۔ (ایضاً، ص ۱۹۱)

اس ایک جملے میں قرب اور یگانگت کے جس سمندر کو بند کر دیا گیا ہے، وہ مولانا ہی کا حصہ ہے۔

اللہ تعالیٰ ہی ان کا سہارا تھا، اور اس کے ساتھ انھیں عبدیت، فقر و احتیاج، اور صبر و استغفار کا جو گہرا تعلق تھا، اس کی ایک جھلک دیکھیے۔ ترغیب اور تحریص کے بعد مولانا مناظر احسن گیلانی کے سامنے خود اپنا کلیجہ چیر کر رکھتے ہیں، لکھتے ہیں:

"آپ کا یہ شبہ کہ میں ابتلا و امتحان کے میدان میں دعوے کے ساتھ اتر رہا ہوں، میری قلبی حالت سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ میں لرزتے اور کانپتے ہوئے اس میدان میں قدم رکھ رہا ہوں۔ اپنی قوت پر نظر ڈالتا ہوں تو وہ اتنی کم نظر آتی ہے کہ مجھے ہر وقت گر جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ مگر جب یہ یاد آتا ہے کہ اس مختصر سے عرصہ حیات میں کتنے گناہ کر چکا ہوں، کتنا زمانہ نافرمانیوں میں گزارا ہے، اللہ کی دی ہوئی کتنی قوتیں محض اپنے نفس کی خوشی پوری کرنے میں صرف کر ڈالی ہیں، اور اب بھی تقویٰ اور عبودیت کا کتنا حقیر سرمایہ میرے پاس ہے، تو مجھے اپنی نجات کی کوئی صورت اس کے سوا نظر نہیں آتی کہ کوئی چوٹ خدا کی راہ میں کھاؤں اور اسی چوٹ کا داغ لیے ہوئے مالک کے دربار میں حاضر ہوں، تاکہ شاید اسی کو دیکھ کر کچھ نظر عنایت ادھر مائل ہو جائے۔ میری حالت اس مریل گھوڑے کی سی ہے جس میں بل بوتا کچھ نہیں ہی، مگر پیچھے سخت کوڑا پیٹھ پر پڑنے کا خطرہ جو اسے لگا ہوا ہے، وہ اس کو ایک پُرخطر راستے پر بھاگ کر چلنے کے لیے مجبور کرتا ہے۔ آپ کو میرے جرات آمیز الفاظ سے یہ گمان گزرتا ہو گا کہ میں اپنے آپ کو کوئی بڑی چیز سمجھ رہا ہوں اور کسی بڑے مرتبے کی توقع رکھتا ہوں، حالانکہ میں جو کچھ کر رہا ہوں صرف اپنے گناہوں کی تلافی کے لیے کر رہا ہوں اور اپنی حقیقت خوب جانتا ہوں۔ بڑے مراتب تو درکنار اگر صرف سزا سے بچ جاؤں تو یہ بھی میری امیدوں سے بہت زیادہ ہے۔ البتہ میں اپنی اس قلبی کیفیت کا کوئی اثر اپنی تحریروں میں نہیں آنے دیتا اور قصداً جرات آمیز زبان استعمال کرتا ہوں کیونکہ اس کام کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ اس کے لیے ڈھیلی اور کمزور زبان موزوں نہیں ہو سکتی"۔ (ایضاً، ص ۲۸۰-۲۸۱)

چودھری نیاز علی خاں کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"خدا سے دعا فرمایئے کہ کامیابی کی توفیق بخشی جائے۔ میں کوئی قوت نہیں رکھتا۔ تنہا اپنی طاقت سے ایک ایسی گری ہوئی قوم کو سنبھالنے کا خیال کروں تو مجھ سے زیادہ بے عقل کوئی نہ ہو گا۔ مجھے

امید جو کچھ بھی ہے صرف یہ ہے کہ اگر میں نے خلوص نیت اور بے غرضی اور للہیت کے ساتھ اپنی قوم کی خدمت کی تو اللہ کی طاقت میرے ساتھ ہوگی اور اسی کی طاقت اصلی طاقت ہے۔ لَاحَولَ وَلَاقُوۃَ اِلَّا بِاللّٰہ"۔ (ایضاً، ص ۱۰۷)

اپنے ایک نہایت عزیز ساتھی چودھری نذیر احمد کی اہلیہ محترمہ کو چودھری صاحب کی بیماری کی شدت اختیار کرنے پر لکھتے ہیں:

"یہ تو اطمینان ہے کہ علاج میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی ہوگی۔ آپ کے صاحبزادے خود ڈاکٹر ہیں اور یہاں اچھے سے اچھے ڈاکٹروں سے علاج کروا سکتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کرنی چاہیے، کیونکہ اصل شفا دینے والا وہی ہے اور اسی کی توفیق سے ڈاکٹر اور دوائیں نفع پہنچاتی ہیں۔ میں خود بھی اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ہمارے نہایت قیمتی رفیق کو جلدی سے مکمل شفا عطا فرمائے تا کہ وہ اس کے دین کی خدمت کر سکیں۔ آپ بھی اکثر یہ دعا مانگا کریں جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سکھائی ہوئی ہے:

اذھب الباس رب الناس ، انت الشافی لاشفاء الاشفاوک شفاء لایغادر سقما "

اس کے علاوہ رات کو سوتے وقت قُل ھُوَ اللّٰہ، قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَق اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاس تین دفعہ پڑھ کر اپنے ہاتھوں پر پھونکیں اور پھر ان کو چودھری صاحب کے سارے جسم پر ملیں، بلکہ اگر چودھری صاحب ہوش میں ہوں تو ان کے ہاتھوں پر پھونکیں اور وہ خود اپنے ہاتھ اپنے سارے جسم پر ملیں۔ یہ رسول اللہؐ کا اپنا طریقہ تھا اور آپؐ کی آخری بیماری میں حضرت عائشہؓ بھی اپنے ہاتھوں پر پھونکتیں اور حضورؐ کے جسم مبارک پر انھیں ملتی تھیں، یا حضورؐ کے دونوں ہاتھوں پر پھونک کر آپؐ کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر جسم اطہر پر انھیں پھیرتی تھیں"۔ (ایضاً، ص ۵۲۱-۵۲۸) (جاری)

حواشی

۱۔ جیسے "غبار خاطر" از مولانا ابوالکلام آزاد، جس کا شمار اس صف میں ہو گا۔ اس طرح شوکت تھانوی کی "بار خاطر" بھی اسی زمرے میں آتی ہے، جو ایک طرح سے "غبار خاطر" کی پیروڈی ہے۔

۲۔ نیاز فتح پوری صاحب کے خطوط کا ایک خاصا حصہ اسی قبیل کا ہے۔

۳۔ سو سے زیادہ افراد اور واقعات کے بارے میں معلومات جمع کرنا خود ایک کارنامہ ہے۔ البتہ ایک جگہ مرتبین سے چوک ہوگئی ہے، محترم چودھری غلام محمد کے نام خط (نمبر ۹۲، ص ۲۰۹) میں کراچی تے جن نقی صاحب کا ذکر ہے اور جن کے سلسلے میں ص ۴۱۳ پر نوٹ دیا گیا ہے، وہ سید نقی علی صاحب نہیں، نقی نواب ہیں جو کراچی کے معروف تاجر ہیں۔ جماعت اسلامی کے ابتدائی ارکان میں سے ہیں۔ تقسیم ملک کے بعد رکنیت بوجوہ جاری نہ رکھ سکے، لیکن مولانا محترم سے گہرا ذاتی تعلق رہا اور تحریک کی دامے، درمے، سخنے مدد کرتے ہیں۔ ایوبی مارشل لا کے زمانے میں مولانا محترم بالعموم نقی نواب صاحب ہی کے گھر نقی ہاؤس میں قیام فرماتے تھے۔

گروہ بھی ہیں جو قانون کی حدود سے باہر سرگرم کار ہیں اور تشدد کا پرچار کرتے ہیں، انھیں جائز طور پر انتہا پسند کہا جاتا ہے۔ انتہا پسند مذہبی بھی ہو سکتے ہیں اور سیکولر بھی۔

ہمارے میڈیا میں سیاسی تشدد، نسلی منافرت اور دہشت گردی کی خبروں میں بالعموم اسلام اور اسلامی بنیاد پرستی کا حوالہ آتا ہے۔ عام قاری کے ذہن میں اسلام کا مجموعی تاثر ایک ایسی تحریک کا ہے جو مغرب دشمن ہے اور اپنے مقاصد کے حصول کے لیے دہشت گردی کرتی ہے۔

ہم اسلام کا بحیثیت مذہب بہت احترام کرتے ہیں۔ اسلام تاریخ کی ایسی تہذیبی تحریک ہے جس نے ہماری تہذیب کو بہت کچھ دیا ہے۔ ایک ارب مسلمانوں کی برادری میں ہمارے بھی کئی لاکھ شہری ہیں۔ اتنی وسیع اور طویل تاریخ رکھنے والی تحریک کو ایک حکیم نہیں لگایا جا سکتا۔ ہمیں زیادہ گہرائی میں تجزیہ کر کے احیائے اسلام کے پس پشت محرکات کو سمجھنا چاہیے۔ اولاً ان علاقوں کے عوام اپنی موجودہ قیادت سے غیر مطمئن ہیں۔ وہ اپنی زندگی بہتر بنانے، بچوں کے لیے بہتر مستقبل کی تعمیر، اور ذمہ دار اور جواب دہ حکومتیں قائم کرنے کے لیے، راستے تلاش کر رہے ہیں۔ وہ موجودہ سسٹم کے خلاف ردعمل کا اظہار کر رہے ہیں۔ ان کا مسئلہ یہ نہیں ہے کہ اسلامی تصورات کے مطابق قائم ہونے والی حکومتیں عدل اجتماعی کا نظام نافذ کر سکیں گی یا جدید کاری (modernisation) کے ساتھ چل سکیں گی، یا مغرب سے رابطہ کے ناگزیر عمل کو مفید انداز سے بروئے کار لا سکیں گی۔

اپنے معاشروں کے مسائل کو حل کرنے کے لیے اسلامی سیاسی گروہ مختلف رویے اور طریقے اختیار کر رہے ہیں۔ کچھ اپنے ملک کے انتخابی عمل میں شریک ہوتے ہیں، کچھ کو ان کے ملکوں میں اس شرکت سے محروم رکھا جاتا ہے، یا وہ خود اپنے ہاں انتخابی قواعد کو غیر منصفانہ سمجھتے ہوئے مسترد کر دیتے ہیں۔ دوسری صورتوں میں بعض اسلامی گروہ موجودہ حکومتوں، مقامی اقلیتوں اور غیر ملکیوں کے خلاف پر تشدد کارروائیاں کرتے ہیں، جس سے Islamists اور حکومتوں کے درمیان تشدد میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ انتہا پسندوں کی کارروائیوں کے باوجود ہمیں علاقے کی حکومتوں اور معاشروں میں اسلام کے کردار کے مطالعہ سے آنکھیں بند نہیں کرنا چاہییں۔ اسی نقطہ نظر سے ہم مغرب کی جامعات میں اسلامی مطالعات کے مراکز کے قیام کی مکمل تائید کرتے ہیں۔

ایک حکومت کی حیثیت سے ہمارا اسلام سے کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ ہماری بعض معاشرتی اقدار اور ہمارے قومی مفادات ضرور ہمیں اسلامی احیا کے بعض پہلوؤں کے بارے میں سوالات اٹھانے پر مجبور کرتے ہیں۔ مثلاً ہم اس موقف کو مسترد کرتے ہیں کہ اسلام کی روایتی اقدار کی طرف مراجعت سے لازماً مغرب سے تصادم ہو گا۔ اسلامی احیا کے بعض مظاہر کھلے مغرب دشمن ہیں، اور صرف مغربی اثرات کو ختم کرنے ہی پر مصر نہیں بلکہ مغرب سے کسی تعاون یا معاشروں کی جدید کاری کے بھی خلاف ہیں۔

ہم سیاسی نظام میں سب کی شرکت کے حامی ہیں 'لیکن ان لوگوں کو شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں جو جمہوری عمل کو اقتدار میں آنے کے لیے استعمال کریں اور پھر اقتدار پر مسلط رہنے کے لیے اس عمل کو ہی تباہ کر دیں۔

ہم عربوں اور اسرائیل کے درمیان امن کو عالمی استحکام اور علاقے کے لوگوں کے معیار زندگی کی بہتری کے لیے لازمی سمجھتے ہیں 'اور اخبارات اور اظہار رائے پر پابندیاں ختم کرنے کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ہم اسلامی گروہوں کو استعمال کرنے کی مذمت کرتے ہیں 'مثلاً شمالی افریقہ میں سوڈان کا خود اپنا' یا ایران کے آلہ کار کی حیثیت سے کردار۔مگر ہمارے خیال میں علاقے میں سرگرم اسلامی تحریکوں کا کوئی مرکزی کنٹرول نہیں ہے۔

آخری تجزیہ میں 'سیاسی 'معاشی اور تعلیمی مواقع سے محرومی 'انتہا پسندوں کو میدان فراہم کرتی ہے۔انتہا پسندی کو شکست دینے کے لیے ان حالات کو درست کرنا ضروری ہے۔چنانچہ ہم اس علاقے کی حکومتوں کو معاشی ترقی 'قانون کی بالادستی اور جمہوری اداروں کے قیام پر ابھارتے رہے ہیں۔ہم مشرق وسطیٰ میں حکومت کا مغربی ماڈل نہیں تھوپتے 'لیکن وسیع تر سیاسی شراکت کو طویل المیعاد استحکام کا اہم اور ضروری عامل سمجھتے ہیں۔

الجیریا کی صورت حال کے بارے میں ہمارا نقطہ نظر 'ہماری اس پالیسی کی واضح مثال ہے۔حکومت امریکہ نے الجیریا کے حکمرانوں پر واضح کیا ہے کہ سیاسی مذاکرات کی فوری ضرورت ہے۔سیاسی شرکت کو وسیع تر کر کے ان اسلامی گروہوں کو بھی شامل کیا جائے 'جو دہشت گردی کے مخالف ہیں۔

کسی ریاست یا گروہ کے ساتھ ہماری پالیسی میں اسلام کوئی عامل نہیں ہے۔ہم اسلام کو مغرب کے مقابلہ پر آنے والا ازم (ism) یا امن عالم کے لیے خطرہ نہیں سمجھتے۔لیکن جب ہمیں شیطان بزرگ کہا جائے 'ہماری تہذیب اور اقدار کی تحقیر کی جائے 'یا ہمارے شہریوں کو یرغمال بنا لیا جائے یا تشدد اور دہشت گردی کی جائے تو ہمیں ضرور اعتراض ہوتا ہے۔

امریکہ علاقے میں امن استحکام اور خوشحالی کے لیے کام کرتا رہے گا 'لیکن اس کے ساتھ عدل اجتماعی اور حقوق انسانی کا ایسا احترام بھی ہو کہ ہر فرد اسے محسوس کرے۔یقیناً یہ بعض ممالک کے اسلامی تصورات کے خلاف نہیں ہے۔

ڈاکٹر ڈینیل پائپنر 'مدیر سہ ماہی مڈل ایسٹ

کیا اسلام 'دشمن ہے؟ نہیں 'مگر بنیاد پرست ضرور دشمن ہیں۔کیا اچھے اور برے بنیاد پرست ہوتے ہیں۔نہیں 'ان میں ایسا کوئی فرق نہیں ہوتا۔امریکہ کو ان سے نبٹنے کے لیے زیادہ موثر اقدامات کرنا چاہییں۔

اسلام اور بنیاد پرست اسلام میں فرق ہے - اپنی ابتدائی صدیوں میں مسلمان اقتدار ' دولت ' خواندگی ہر لحاظ سے غیر مسلموں سے آگے تھے - اسلام کے ساتھ انھیں دنیا میں کامیابی اور عروج بھی حاصل تھا - مگر اب گزشتہ دو صدیوں سے اسلام ایک بحران کا شکار ہے - ۱۷۹۸ میں مصر میں نپولین کی آمد کے بعد سے مسلمانوں کے لیے دنیا اب وہ نہیں رہی ہے - اس کا کیا حل ہے؟ اس کے تین جوابات ہیں - سیکولرسٹ کہتے ہیں ' اس کا حل یہ ہے کہ مسلمان مغربی تہذیب اختیار کر لیں یعنی مذہب کو ذاتی معاملہ قرار دے دیں - ریفارمر کہتے ہیں کہ مغرب سے وہ کچھ لیا جائے جو مفید ہے - بنیاد پرست اسلام سے وابستہ رہنے کو مسئلہ کا حل قرار دیتے ہیں کہ اسی طرح خوشحالی اور عروج حاصل ہو سکتا ہے - بنیاد پرست مغربی طور طریقوں کو (ماسوائے طبی علوم ' یا فوجی ٹیکنالوجی) مسترد کرتے ہیں اور یہ الزام لگاتے ہیں کہ مغرب سازشوں کے ذریعے اسلام کو نقصان پہنچا رہا ہے اور اپنی دل فریب ثقافت کے ذریعے نوجوانوں کو اپنے اندر جذب کر رہا ہے - اس طرح وہ دین سے دور ہو جاتے ہیں اور مسلم معاشرہ کو اسلامی خطوط پر استوار کرنا ممکن نہیں رہتا - بنیاد پرستوں نے مخصوص سیاسی ' معاشی اور اجتماعی تصورات پر مبنی اپنا نظریہ حیات مرتب کر لیا ہے (جیسا کہ ملائیشیا کے رہنما انور ابراہیم کہتے ہیں کہ ہم سوشلسٹ نہیں ' سرمایہ دار بھی نہیں ' ہم اسلامی ہیں) اس طرح کا سیاسی اسلام بیسویں صدی کی ہی چیز ہے - یہ روایتی اسلام سے بالکل مختلف ہے - آج مغرب اور اسلام سے زیادہ مسلمانوں کے ' یعنی بنیاد پرستوں اور سیکولرسٹوں کے درمیان جنگ جاری ہے - کوئی بھی اخبار اٹھا کر دیکھیں تو اس کا اندازہ ہو جائے گا - بنیاد پرست اور سیکولرسٹ کسی مسلم معاشرے کا ۱۰ فی صد سے زائد نہیں ' لیکن یہ منظم اور فعال ہیں اور سیاسی لحاظ سے سرگرم ہیں -

ہم غیر مسلم تو اس صورت حال کا صرف نظارہ کرتے ہیں - امریکی ہونے کی حیثیت سے ہمارا رول دوسرے غیر مسلموں سے کچھ زیادہ ہے -

اب میں اپنے اس سوال کی طرف آتا ہوں کہ کیا ہم اچھے اور برے بنیاد پرستوں کے درمیان تمیز کر سکتے ہیں - مجھے کلنٹن انتظامیہ کے اس موقف سے اختلاف ہے کہ صرف وہی بنیاد پرست ہمارے مفادات کے خلاف ہیں جو دہشت گردی کی سرگرمیوں میں ملوث ہیں - یہ سب ہی اپنی اصل میں انتہا پسند ہیں اور ہماری تہذیب سے نفرت کرتے ہیں - یہ مسلم ممالک میں اسلامی قانون کے نفاذ اور ان کی حدود میں توسیع کے علم بردار ہیں - جارحیت ان کے موقف کا لازمی جزو ہے - حکمت عملی کے طور پر یہ اپنا موقف تبدیل کر لیتے ہیں لیکن اسے ترک نہیں کرتے - ان کا طرز حیات ہمارے مقاصد سے بالکل مختلف ہے - اس لیے امریکہ کو بنیاد پرستوں سے تعاون اور حوصلہ افزائی کی پالیسی ہرگز اختیار نہ کرنا چاہیے ' بلکہ ان سے مذاکرات بھی نہیں کرنا چاہییں - ہمیں تو ان کے خلاف اٹھ

کھڑے ہونا چاہیے۔

بلاشبہ اصولی موقف اپنی جگہ ہے اور عملی حقائق اپنی جگہ۔ بعض اوقات بنیاد پرستوں سے تعاون صحیح پالیسی ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر افغانستان میں امریکہ کا بنیاد پرستوں سے تعاون۔ یہ بڑی برائی کے مقابلے میں چھوٹی برائی کا ساتھ دینا تھا۔ کویت کے مسئلہ پر ہم نے عراق کے خلاف ایران کے ساتھ خفیہ طور پر کام کیا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ہم نے ہٹلر کے خلاف اسٹالن سے تعاون کیا۔

کچھ عرصے قبل ہی لیفٹ کی عالمی تنظیم امریکی مفادات کے لیے خطرہ تھی اور رائٹ کی حکومتیں ہمارے لیے کوئی خطرہ نہ تھیں۔ ہم نے رائٹ کے ساتھ تعاون کیا۔ اب صورت حال الٹ گئی ہے۔ ہمارے لیے رائٹ کے خلاف لیفٹ کے ساتھ تعاون کرنا زیادہ مناسب ہے۔ لیفٹ کی باقی ماندہ حکومتیں، (مثلاً الجیریا میں ایف ایل این یا افغانستان میں دوستم) صرف اقتدار ہی چاہتی ہیں، ہماری دشمن نہیں ہیں۔ جبکہ رائٹ، بشمول بنیاد پرست مسلمان، بین الاقوامی طور پر منظم ہیں اور جارحانہ لائحہ عمل پر عمل پیرا ہیں۔ ایران و سوڈان کی مادی مدد کے علاوہ، ایک بین الاقوامی عمل کا حصہ ہونے کی وجہ سے نفسیاتی طور پر اپنے کو طاقت ور سمجھتے ہیں۔ ان کی نظروں میں امریکہ کھٹکتا ہے۔

ہمیں بنیاد پرست مسلمانوں کے خلاف فعال پالیسی اختیار کرنا چاہیے، لیکن عام مسلمانوں کے خلاف نہیں۔ ہماری پالیسی مذہب اسلام کے خلاف نہیں، بنیاد پرست اسلام کے انقلابی نظریے کے خلاف ہو۔ ہمیں اعتدال پسند مسلمانوں کو بنیاد پرست نہیں قرار دینا چاہیے۔ اعتدال پسند تو بنیاد پرستوں سے خود ہی بہت سے مسائل میں الجھے ہوئے ہیں۔ وہ غیر مسلموں سے زیادہ بنیاد پرستوں سے نفرت کرتے ہیں۔

ہماری حکمت عملی کیا ہو؟ ہمیں بنیاد پرستوں کو اپنے پختہ ارادے کا یقین دلانا چاہیے۔ انھیں سمجھنا چاہیے کہ ہمیں اپنے کلچر پر فخر ہے اور ہم اپنے مقاصد کے لیے لڑ بھی سکتے ہیں۔ امریکی، فحاشی اور نشہ کے اسیر نہیں ہیں وغیرہ۔ یہ بڑی سادہ باتیں ہیں، لیکن آپ بنیاد پرستوں کا لٹریچر پڑھیں تو آپ قائل ہو جائیں گے کہ انھیں یہ باتیں بار بار بتانے کی ضرورت ہے۔

ہمیں ان حکومتوں کی مکمل حمایت کرنا چاہیے، جو بنیاد پرستوں سے جنگ میں مصروف ہیں۔ الجیریا کے معاملے میں ہمیں فرانس کا ساتھ دینا چاہیے اور واضح کر دینا چاہیے کہ ہم بنیاد پرستوں کو اقتدار میں نہیں دیکھنا چاہتے۔ اگر وہ اقتدار میں آ ہی جائیں تو ہم ان کے ساتھ چلنے کی کوشش کریں گے۔ اس مرحلہ پر ہمیں واضح کرنا چاہیے کہ ہم حکومت الجیریا کے ساتھ ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ ایک بدعنوان حکومت ہے، اس کی بڑی خراب تاریخ ہے، مگر پھر بھی بنیاد پرست حکومت پر قابل ترجیح ہے۔ یہ ہمارے مفادات کے لیے خطرہ نہیں ہے۔ انسانی حقوق کے لیے یہ کسی بنیاد پرست حکومت سے کم

نقصان دہ ہے۔ الجیریا کی غیر معمولی اہمیت ہے۔ یہاں کے حالات مغربی یورپ اور مشرق وسطی پر اثرانداز ہوں گے۔ ہمیں بنیاد پرستوں کی حکومت کسی بھی جگہ گوارا نہیں ہونی چاہیے: مصر میں، ترکی میں، اردن میں یا فلسطینیوں کی قیادت میں۔

دوسری تدبیر کے طور پر مغرب کو سوڈان اور ایران پر دباؤ ڈالنا چاہیے کہ ان کی جارحیت کم سے کم تر ہو۔ ہمارے ہاتھ میں اقتصادی اور سفارتی ہتھیار ہیں اور فوجی متبادل بھی ہر وقت موجود ہے۔

تیسرے، ہمیں ایسے اداروں اور افراد کی مدد کرنا چاہیے جو بنیاد پرستوں کی لعنت کے خلاف کھڑے ہیں۔ رشدی کے واقعہ کے بعد سیکولرسٹ مسلمان مشرق وسطی میں ایک بڑی مصیبت میں ہیں۔ بنیاد پرستوں کے مخالف مسلمان ہماری طرف امید کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ ہمیں اپنا رسوخ اور مال و دولت ان بہادر آدمیوں کی حمایت میں استعمال کرنا چاہیے۔

آخری بات یہ کہ ہمیں جمہوریت کے بارے میں بہت محتاط رہنا چاہیے۔ انتخابات اور جمہوریت کو ہم معنی سمجھ لیا گیا ہے۔ ہمیں اس کے بجائے سیاسی شرکت، قانون کی بالادستی، مذہب اور رائے کی آزادی اور اقلیتوں کے حقوق دینے پر زور دینا چاہیے۔ پہلے امن، پھر مہذب معاشرہ، پھر انتخابات! اگر انتخابات میں جلدی کی جائے تو الجیریا کی طرح جمہوریت دشمن آگے آجاتے ہیں اس لیے کہ وہ زیادہ منظم ہیں اور ووٹر صحیح فیصلہ نہیں کر پاتے۔

جان ایسپوسیتو، ڈائرکٹر مسلم عیسائی مرکز، جارج ٹاؤن یونیورسٹی

سیاسی اسلام کو جسے بنیاد پرست اسلام کہا جاتا ہے، مشرق وسطی کے استحکام کے لیے اور مسلم دنیا میں مغربی مفادات کے لیے خطرہ قرار دیا جاتا ہے۔ ایرانی انقلاب اور اس کے بعد ہونے والے متعدد واقعات نے عالمی سیاست میں اسلام کی جارحانہ پیش قدمی کے احساس کو تقویت دی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انقلاب ایران نے ہماری سوچ کو اس قدر متاثر کیا ہے کہ ہم آج دنیائے اسلام میں رونما ہونے والے واقعات کو اس سے آزاد ہو کر نہیں دیکھ سکتے۔

سعودی عرب، ایران، پاکستان اور دوسرے مسلم ممالک کی حکومتوں میں سے ہر ایک کا اسلام سے تعلق کا اپنا انداز ہے۔ کچھ ہمارے دوست ہیں اور کچھ ہماری دہشت گرد فہرست میں۔ اب ہم میں سے بہت سے یہ کہتے ہیں کہ ہم اسلام یا اسلامی تحریکوں کو لازماً مسئلہ نہیں سمجھتے، ہم صرف انتہاپسندوں کو مسئلہ سمجھتے ہیں۔ دنیا میں بہت سی مسلمان حکومتیں اور اسلامی تحریکیں ہیں۔ ان میں سے کچھ سیاسی نظام کا حصہ ہیں۔۔۔ ایک اقلیت انتہاپسند ہے اور اپنی حکومتوں کا تختہ الٹنے کا پروگرام رکھتی ہے۔ کچھ مغرب دشمن ہیں۔ ہمیں انتہاپسندوں اور حقیقت پسندوں میں فرق کرنا چاہیے۔

۸۰ کے عشرے میں انقلاب ایران نے ہماری رائے کو متاثر رکھا۔ اب ۹۰ کے عشرے میں واضح طور پر نظر آرہا ہے کہ انتہا پسندی کے ساتھ ساتھ ' اسلامی تحریکیں اپنے معاشروں میں سیاسی اور معاشرتی قوت کی حیثیت سے کام کر رہی ہیں۔ ۸۰ کے عشرے میں ان تحریکوں کو انتہا پسند سمجھ کر جبر سے دبانے کی کوشش کی گئی۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ انھیں سسٹم میں آنے دیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ ان کے پیروکار زیادہ نہیں ہیں۔ لیکن کوئی بھی خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھا۔ یہ اعتدال پسند اسلامی گروہ ' تعلیمی اور رفاہی خدمات انجام دے رہے ہیں اور سیاسی نظام میں شریک ہوتے ہیں ' اب جدید تعلیم یافتہ ' سیکولر کے ساتھ ساتھ اسلامی ذہنیت رکھنے والی ایک نئی نسل موجود ہے۔ جب ہم بنیاد پرستوں کا جائزہ لیتے ہیں تو اسلامی فکر کے حامل جدید تعلیم یافتہ نسل بھول جاتے ہیں۔ مسلم ممالک کے انتخابات میں یہ گروہ کبھی تو مضبوط حزب اختلاف کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آتے ہیں اور کبھی الجیریا کی طرح ' لگتا ہے کہ یہ اقتدار میں آنے والے ہیں۔ بس ' یہیں سے مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔

سیاست ' جمہوریت اور مغرب کے اسلام سے تعلق کے حوالے سے مسلم معاشروں میں بہت سی بحثیں جاری ہیں۔ اسلام کا نمائندہ کون ہے؟ اسلامی تحریکوں سے باہر جو مسلمان ہیں ' کیا وہ مسلمان نہیں؟ اسلام کی تعبیر کون کرے گا ' بادشاہ ' جنرل یا پارلیمنٹ؟ پھر سوال ہے کون سا اسلام؟ کیا ماضی کو اٹھا کر ویسے کا ویسا ہی رکھ دیا جائے گا یا اس میں اصلاح کی جائے گی۔ پھر ایک مسئلہ جمہوریت کا ہے۔ امریکہ کسی ایسی تحریک کا ساتھ نہیں دے سکتا ' جو ایک دفعہ اقتدار میں آکر جمہوریت کو اغوا کر لے اور انتخابات بس ایک ہی دفعہ ہو کر رہ جائے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ اسلامی تحریکوں کے بارے میں تو یہ معلوم نہیں ہے کہ ان کا رویہ جمہوریت کے ساتھ کیا ہو گا ' لیکن ایسے ممالک ہیں جہاں اقتدار پر قابض عناصر جمہوریت دشمنی کی تاریخ رکھتے ہیں ' وہ انتخابات کرواتے ہیں ' نتیجہ مرضی کے مطابق نہیں آتا ' تو سب کچھ لپیٹ دیتے ہیں۔ اسی طرح ' الجیریا میں کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اسلامی فرنٹ کے پاس معاشی پروگرام نہیں ہے ' تو ایف۔ ایل۔ این کی حکومت نے تو تیس برس میں ثابت کیا ہے کہ اس کے پاس معاشی پروگرام نہیں ہے۔ ان ممالک کے حکمران اختلاف کو برداشت نہیں کرتے ہیں۔ عوامی احتجاج کے نتیجہ میں سیاسی عمل کے راستے کھلے ' لیکن اختلاف کی پہلی ہی علامات پر راستے مسدود کرنے اور اسلامی تحریکوں کو کچلنے کے اقدامات کیے گئے۔ یہی الجیریا میں ہوا ' تیونس میں ہوا اور یہی مصر میں ہو سکتا ہے۔ اعتدال پسندوں اور انتہا پسندوں میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے ' بلا امتیاز سیاسی جبر و تشدد کیا جا رہا ہے۔ اس رویے سے تشدد اور جوابی تشدد کا مسلسل بڑھنے والا سلسلہ قائم ہونے کا اندیشہ ہے۔

مصر میں اخوان المسلمون اور پاکستان میں جماعت اسلامی کی مثال سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ دونوں بہت طویل مدت سے کام کر رہی ہیں ' حزب اختلاف میں رہی ہیں مگر مصر میں خصوصاً ناصر کے

دور میں ٬جبر و تشدد کے ردعمل میں متشدد گروہ قائم ہوئے ' لیکن پاکستان میں حکومت نے مصر کی طرح کا ظلم و ستم نہیں کیا ' اس لیے جماعت نے اس طرح کے پر تشدد ذرائع اختیار نہیں کیے ۔ ملائیشیا میں اسلامی گروہوں کو کام کرنے کا موقعہ ملا ۔ ملائیشیا اور پاکستان کی مثال سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر اسلامی گروہوں کو کام کرنے کا موقعہ دیا جائے تو وقت کے ساتھ ان میں تبدیلی آتی ہے ۔ وہ حکومت کے لیے براہ راست خطرہ نہیں رہتے ۔ بلکہ جیسا کہ پاکستان کے گزشتہ انتخابات سے معلوم ہوتا ہے معاشرے میں اور سیاسی نعرہ بازی میں مقام رکھنے کے باوجود اپنا سیاسی رسوخ کھو دیتے ہیں ۔ عرب دنیا سے باہر دیکھنا مفید ہو سکتا ہے ۔ ملائیشیا اور پاکستان کے لیڈر کہتے ہیں کہ ہم گرفتار ہوئے ' جیلوں میں رہے ' ہم گھروں پر نظر بند کیے گئے لیکن یہ سب کچھ اتنا تکلیف دہ نہ تھا ۔ اگر ہم کسی عرب ملک میں ہوتے تو قتل کر دیے جاتے ۔ حکومت کے جبر و تشدد سے مہم جوئی میں اضافہ ہونا ' قابل غور ہے ۔ حکومت کی پالیسیاں اعتدال پسندوں کو انتہا پسندی کی طرف دھکیل رہی ہیں ۔ مصر میں اخوان المسلمون اور جماعت الاسلامیہ میں امتیاز کرنا ضروری ہے ۔ اگر ان کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا گیا تو انتہا پسندی میں لازماً اضافہ ہوگا ۔

زیادہ تر اسلامی تحریکیں ' دوسری سیاسی پارٹیوں کی طرح ہیں ۔ آج پوری دنیا میں مذہب کا احیا ہو رہا ہے ۔ یہ صرف مسلم دنیا کا عمل نہیں ہے ۔ بہت سے مذاہب کے لوگ آپس میں مختلف مسائل پر دست و گریباں ہیں ۔

جہاں تک اس علاقے کے حقائق کا سوال ہے ' سیاسی اسلام کو باقی رہنا ہے ۔ یہ سمجھنا کہ ملازمتیں فراہم کرنے سے صورت حال تبدیل ہو جائے گی ' غیر حقیقت پسندانہ ہے ۔ بعض ممالک ' جہاں اسلامی احیا فعال ہے ' غربت کا شکار ہیں ' بعض نہیں بھی ہیں ۔ بعض ممالک میں بے روزگار نوجوان اسلامی احیا کی طرف آ رہے ہیں ' لیکن مصر اور اردن میں ' ڈاکٹر ' انجینر اور وکلا اس تحریک کا حصہ بن رہے ہیں ۔

ہمیں سیکولر بنیاد پرستی سے بچنا چاہیے ۔ سیکولرزم ایک متبادل راستہ ہے ' واحد راستہ نہیں ۔ دوسرے جو راستہ پیش کر رہے ہیں وہ بھی درست ہو سکتا ہے ۔

مغرب کی تاریخ کو دیکھیے ' نشاۃ ثانیہ کے بعد مذہبی بحث ہی نہیں ' خون خرابہ ہوا ۔ صرف سیاسی مباحثے نہیں ہوئے ' خانہ جنگیاں ہوئیں ۔ سیاسی نظام کے راستے کھلے ہوں تو اسلامی تحریکیں اور دوسرے سب ہی آگے آئیں گے ۔ اگر مضبوط حزب اختلاف بنتی ہے تو کثیر جہتی معاشرہ قائم ہوگا ۔ اسلامی تحریکیں سیاسی مسائل پر موقف اختیار کریں گی تو انھیں از سر نو غور و فکر کرنا اور اپنے نظریات کو تبدیل کرنا ہوگا ۔ یہ بھی یاد رکھیے ' اگر اسلامی تحریکیں بر سر اقتدار آ گئیں تو انھیں اپنے ملکی حالات میں ' اور باہم منحصر بین الاقوامی دنیا میں کام کرنا ہوگا ۔ میرا خیال ہے کہ اکثریت سسٹم کے اندر کام کرے گی ۔

ملازمت ' مائیں اور بچے

اخذ و تلخیص: مسلم سجاد

خواتین کام تو ہمیشہ سے کرتی رہی ہیں لیکن باقاعدہ ملازمت جس کی پابندیاں ہوں اور مقررہ اوقات میں گھر سے غیر حاضر رہنا پڑے ' غالباً اس دور کا تحفہ ہے ۔ مغربی معاشرے میں عورت کے جس مقام کو ہمارے معاشرے کی بعض خواتین رشک کی نظروں سے دیکھتی ہیں ' اس کا ایک لازمی حصہ یہ ملازمت ہے ۔ بلکہ یہ مقام اس ملازمت اور معاشی دوڑ میں شرکت کا مرہون منت ہی سمجھا جاتا ہے ۔ مسلم معاشروں میں بھی آہستہ آہستہ اس رجحان میں اضافہ ہو رہا ہے ۔ خود پاکستان میں جو کچھ منظر ہے ' وہ سامنے ہے ۔ اس کا جواز ' یا بعض حلقوں کے نزدیک عدم جواز ' معاوضوں میں عدم مساوات ' جائے ملازمت کے طرح طرح کے مسائل ' آمدورفت کی پریشانیاں ' حجاب و ستر کی حدود کا لحاظ ' گھریلو زندگی پر اثرات سب ہی جائزوں اور تحقیق کا موضوع ہیں کہ ان سے رویے بنتے ہیں اور پالیسیاں تشکیل پاتی ہیں لیکن اس وقت صرف ایک پہلو پیش نظر ہے اور وہ بچوں کے حوالے سے ہے ۔

مغربی معاشرے میں ہر طرح کے حالات ' تحقیق کے نتیجے میں دو اور دو چار کی طرح واضح ہو جاتے ہیں ۔ اسی لیے جہاں ہم اپنے ملک یا دوسرے اسلامی ممالک کے بارے میں بعض امور میں بالکل تاریکی میں ہوتے ہیں ' مغربی معاشرہ کے وہ امور روز روشن کی طرح عیاں ہوتے ہیں ۔ رسالہ Commentary (فروری ۹۶) میں Yale یونیورسٹی کے پروفیسر David Gelernte کا ایک مضمون Why Mother's Should Stay at Home شائع ہوا ہے جس میں ملازمت پیشہ ماؤں کے بچوں کے حوالے سے کچھ امور کی طرف توجہ دلائی گئی ہے ۔ اگر ہمارے ملک کے تحقیقی ادارے اور جامعات بھی اس طرح کے تحقیقی منصوبوں پر کام کروائیں تو یقیناً مفید رہنمائی مل سکتی ہے ۔

فاضل مضمون نگار کے مطابق :

امریکی بچوں کا بہت برا حال ہے ۔ منشیات کا استعمال ' خودکشی کی شرح میں اضافہ ' تشدد کا بڑھتا

ہوا رواج، تعلیمی کارکردگی، ہر لحاظ سے ان کی ناکامی اعداد و شمار سے ثابت ہے۔ صحت اور دوسرے ضروری اشاریے موجودہ نسل کی زندگی میں ہر سال نیچے ہی کی طرف گئے ہیں۔ اس صورت حال کے ایک سب سے بڑے سبب کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور وہ یہ ہے کہ امریکی والدین چند عشرے قبل اپنی اولاد کو فی ہفتہ ۳۰ گھنٹے دیتے تھے اب صرف ۱۷ گھنٹے دیتے ہیں۔ بچوں کی تربیت میں کمی اچانک واقع نہیں ہوگئی بلکہ گزشتہ دو عشروں میں لیبر فورس میں ۲۴ سے ۳۰ سال کی شادی شدہ خواتین کا اوسط جو ۱۹۶۵ میں ۳۲ فی صد تھا، ۱۹۸۵ میں ۶۵ فی صد تک پہنچ گیا۔

کیا ان دو حقائق میں کوئی باہمی ربط ہو سکتا ہے؟ بیشتر تحقیقات کا ماحصل یہ ہے کہ اگر مائیں اپنے بچوں کی دیکھ بھال کے لیے کل وقت گھر پر رہیں تو مجموعی طور پر یہ بچوں کے لیے اس سے بہت بہتر ہے کہ وہ انھیں دن کے دیکھ بھال کے مراکز پر چھوڑ جائیں۔ ایک کتاب Meaningful Difference کے مصنف Todd Risely اور Betty Hart کہتے ہیں کہ ایک بچے کا ذہنی نشوونما بنیادی طور پر اس پر منحصر ہے کہ پہلے تین چار برسوں میں اسے اپنے بڑوں سے کتنی توجہ ملی اور یہ حقیقت ہے کہ دیکھ بھال کے مرکز میں کل وقتی ماں جتنی توجہ نہیں دی جاتی۔ بچوں کے ماہر نفسیات Joy Belsky دیکھ بھال کے مراکز کے بڑے حامی تھے اب کہتے ہیں کہ شواہد نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ مراکز بچوں کی شخصیت کے لیے الٹا نقصان کا موجب ہوتے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں، عام سی بات ہے جو ہم سب جانتے ہیں کہ محبت کی خاطر بچوں کی دیکھ بھال کرنے والا تنخواہ کے عوض کرنے والے سے بہتر کرے گا۔ تعجب کی اصل بات یہ ہے کہ جو بات ہم سب وجدانی طور پر جانتے ہیں کوئی اسے بلند آواز سے کہنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

موجودہ صورت کا جواز خواتین کی آزادی اور ان کے لیے انصاف کے حوالے سے پیش کیا جا رہا ہے۔ اگر مردوں کے کیریر اور گھریلو زندگی ساتھ ساتھ چل سکتے ہیں تو عورت کے کیوں نہیں چل سکتے۔ تنخواہ دار ملازمت عورتوں کی نو دریافت آزادی کی اصل اساس ہے۔ عورتیں مردوں جتنی قابل ہیں، وہ ان کی طرح پوری تعلیم اس لیے تو نہیں حاصل کرتی ہیں کہ اپنے بچوں کے کپڑے دھویا کریں۔ لیکن اب اس دلیل نے اپنا وزن کھو دیا ہے۔ اگر یہ درست ہے تو جدید دور کی ماؤں کو پرمسرت زندگی گزارنا چاہیے۔ چند یقیناً ملازمت کی جگہ پر گھر سے زیادہ خوشی محسوس کرتی ہیں مگر زیادہ تر کو یہ احساس ستاتا رہتا ہے کہ جب ان کے بچے اسکول سے واپس آتے ہیں تو وہ گھر پر نہیں ہوتیں۔ ملازمت پیشہ ماؤں سے تفصیلی تبادلہ خیال کے بعد ایک تحقیق کار نے یہ ماحصل پیش کیا ہے کہ گھر اور ملازمت کی کشاکش پریشانی کا باعث ہوتی ہے اور جب شدید ہو جائے تو جرم کا احساس ان کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔ اس لیے اب خواتین کی ملازمت کے لیے استدلال آزادی وغیرہ کے

بجائے صرف رقم کا حصول رہ گیا ہے۔ دو تنخواہیں گھروں کی ضرورت بن گئی ہیں۔ کوئی ظالم اور ناواقف ہی عورتوں کو الزام دے سکتا ہے کہ انھوں نے گھر کی ذمہ داریوں کو نظرانداز کر کے خود غرضی کا رویہ اختیار کرتے ہوئے ملازمت کی ہے۔

معاشی ضرورت کی دلیل بظاہر بہت وزنی محسوس ہوتی ہے' لیکن بالکل بے بنیاد ہے۔ ایک وقت تھا کہ ہم آج سے زیادہ غریب ہوتے تھے اور عورتیں گھروں پر رہتی تھیں۔ یقیناً بہت سی مائیں اپنے اہل خاندان کو دو وقت کی روٹی فراہم کرنے کے لیے ملازمت پر مجبور ہوتی ہیں' مگر امریکہ جیسے بے حد امیر ملک میں محض ناگزیر ضرورت اس بڑے پیمانے پر خواتین کی ملازمت کا سبب قرار نہیں دی جا سکتی' جس نے معاشرے کو تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔

۱۹۶۵ کے مقابلے میں' جب بہت کم مائیں ملازمت کرتی تھیں' ہم بہت مال دار ہیں۔ امریکی جتنے مال دار آج ہیں' اپنی تاریخ میں کبھی نہ تھے۔ درحقیقت معاشی ضرورت کے استدلال کی بنیاد یہ نہیں ہے کہ امریکی خاندانوں کو زیادہ رقم کی ضرورت ہے' بلکہ یہ ہے کہ اب وہ معیار زندگی کو بہتر کرنے کے لیے زیادہ رقم خرچ کر سکتے ہیں۔ گزشتہ زمانے میں لوگ کم پر گزارا کر لیتے تھے۔ لیکن آج ماؤں کی آمدنی اس لیے اہم ہے کہ اس سے وہ چیزیں خریدی جاتی ہیں جن کی ایک اہمیت یہ بھی ہوتی ہے کہ دوسرے یہ خرید چکے ہیں۔

وہ عورت جو آج اپنا وقت مثلاً کسی بنک میں کام کر کے گزارتی ہے ایک نسل قبل' اپنے بچوں کی پرورش میں گزارتی' لیکن زیادہ چھوٹے گھر میں رہتی' اس کی اپنی کار نہ ہوتی' اس نے دنیا کی سیاحت نہ کی ہوتی۔ آج بھی مالی قربانی سے قطع نظر موقعہ دیا جائے تو بیشتر عورتیں گھر پر رہنے کا انتخاب کریں گی۔ دراصل تبدیلی یہ واقع ہوگئی ہے کہ ماضی میں ماؤں سے گھر پر رہنے کی توقع کی جاتی تھی۔ آج ان سے کام اور ملازمت کی توقع کی جاتی ہے۔ آزادی نسواں کے حامی کہتے ہیں کہ ۱۹۳۵ میں خواتین معاشرہ کے دباؤ کی وجہ سے گھر پر رہتی تھیں۔ اگر یہ دلیل جب درست تھی' تو آج ملازمت پیشہ خواتین کے لیے بدرجہ اولیٰ درست ہے۔ تقریباً پورا معاشرہ خواتین کی ملازمت کے حق میں ہے۔

یہ سب کچھ کیسے ہوا' ایک طویل کہانی ہے' لیکن ہم یہ دیکھیں کہ اس سے سب سے زیادہ فائدہ کسے ہوا ہے؟ تحریک نسواں دوسرے مقاصد کے لیے بھی کام کر سکتی تھی۔ کل وقتی ماں کے لیے عزت کا مقام حاصل کر سکتی تھی۔ معاشرے کے لیے کل وقتی ماں کی اہمیت تسلیم کروا سکتی تھی۔ ماضی میں کسی معاشرہ کو اتنی کثیر تعداد میں تعلیم یافتہ ماؤں سے فائدہ اٹھانے کے مواقع حاصل نہ تھے۔ ہم انھیں ان کی مناسبت سے مرکزی مقام دیتے تو تہذیبی و معاشرتی احیا کی ایک تحریک برپا ہو جاتی' مگر اس کے برعکس یہ نعرہ دیا گیا: عزت حاصل کرنا ہے تو ہر وہ کام کرو جو مرد کرتے ہیں!

یہ تبدیلی امریکہ میں آزادانہ جنسی تعلقات کے بہاؤ کا نتیجہ ہے جس نے معاشرتی بندھن کو توڑ دیا۔ اس سے مرد فطری طور پر بہت خوش ہوئے اور لطف اٹھانے والوں میں آگے آگے ہو گئے۔ خواتین کے لیے یہ پسندیدہ صورت حال نہ تھی۔ ڈیٹ پر عصمت دری کے خلاف مہم اس کا ثبوت ہے کہ جنس کے معاملے میں مساوی حقوق صرف دھوکہ اور فریب ہیں۔ یہ خیال تھا کہ شادی کے بغیر جنسی تعلقات میں رکاوٹ، ایر پورٹ پر آنے والوں اور استقبال کرنے والوں کے درمیان وہ حد فاصل ہے جو گرانے سے خوشی خوشی ملاقاتیں ہوں گی لیکن معلوم ہوا کہ یہ تو چڑیاگھر کا جنگلہ تھا جس میں مرد بند تھے اور عورتوں کو تحفظ حاصل تھا۔ ماؤں کے گھر رہنے کا ضابطہ بھی اسی نوعیت کا ثابت ہوا ہے۔ شاید چند پابندیاں محسوس کرتی ہوں، بیشتر کو تو تحفظ حاصل تھا۔ میرا اندازہ ہے کہ بہت سی مائیں دولت، اختیارات یا اسٹیٹس کے مقابلے میں اپنے بچوں کے مفادات کو زیادہ اہمیت دیتی ہیں۔ بہت سے سروے اور جائزے یہ ثابت کرتے ہیں کہ مائیں بچوں سے، جو تعلق محسوس کرتی ہیں، مرد نہیں کرتے۔ ماضی میں معاشرے کا شوہروں پر دباؤ ہوتا تھا کہ وہ اپنی بیویوں کو ملازمت نہ کرنے دیں۔ اب ایسا نہیں ہے۔

جن دفتروں اور اداروں میں عورتیں کام کر رہی ہیں، وہاں ان کا ساتھ سب کو اچھا لگتا ہے۔ نہ میں، نہ ان کے ماتحت، نہ ان کے افسر، نہ ان کے شوہر کوئی بھی نہیں چاہتا کہ وہ یہ ملازمت چھوڑ دیں۔ لیکن کیا ان کے بچے بھی یہی چاہتے ہیں؟ یہ وہ سوال ہے جس کا ہم سامنا نہیں کر سکتے۔ اس لیے ہم یہ سوال پوچھتے ہی نہیں۔

شیخ محمد الغزالی رحمہ اللہ

حافظ محمد ادریس

امام حسن البنا شہید کے رفقا خصوصی میں سے ایک، شیخ محمد الغزالی ۹ مارچ ۱۹۹۶ کو سعودی عرب میں انتقال فرما گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔

شیخ محمد الغزالی کی پوری زندگی حتیٰ کہ موت بھی مثالی اور قابل رشک تھی۔ وہ زندگی بھر اللہ کے دین کی خدمت میں مصروف رہے، موت آئی تو انھیں آن ڈیوٹی پایا۔ وہ ریاض میں ایک مذاکرہ میں "اسلام اور مغربی دنیا" کے موضوع پر خطاب فرما رہے تھے کہ دل کے دورے نے آلیا۔ حق مغفرت کرے، یہ مقام بلند ہر کسی کے حصے میں کہاں آتا ہے!

محمد الغزالی ہم سے بچھڑ گئے ہیں، مگر اپنے اعمال جلیلہ اور تصنیفات عظیم کی بدولت وہ آج بھی ہمارے ساتھ ہیں اور قیامت تک قافلہ حق کے لیے روشنی بکھیرتے رہیں گے۔ انھوں نے جس موضوع پر قلم اٹھایا، اس کا حق ادا کیا۔ وہ زود نویس تھے مگر ان کی تحریریں، پختہ خیالی، ندرت، علمیت اور اعلیٰ تحقیق کی آئینہ دار ہیں۔ وہ سطحی انداز میں لکھتے تھے، نہ بولتے تھے۔ معاصر علما نے ان کی بعض آرا سے اختلاف کیا مگر ان کے علمی مرتبے اور دلائل کی صلابت کا انکار کوئی نہیں کر سکا۔ ان کی تصانیف سو سے زائد ہیں جب کہ ہزاروں مقالے اور تقاریر بھی ان کے علمی ترکے میں شامل ہیں۔

شیخ محمد الغزالی مصر کے ضلع البحیرہ کے ایک گاؤں میں ۲۲ ستمبر ۱۹۱۷ کو پیدا ہوئے۔ انھوں نے اپنے گاؤں میں قرآن مجید حفظ کیا اور ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اسکندریہ کے معہد علمی سے ثانوی تعلیم مکمل کرنے کے بعد جامعہ ازہر میں داخل ہوئے اور ۱۹۴۳ میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ انھوں نے حصول علم میں اپنے آپ کو کھپا دیا اور غیر معمولی مقام حاصل کیا۔ انھوں نے قدیم و جدید علوم کا گہرا مطالعہ کیا۔ اخوان میں شامل ہونے کے بعد وہ سرگرم کارکن بن گئے۔ انھوں نے بڑی تندہی سے کام کیا، وہ بہت اچھے خطیب تھے۔ ان کے خطبوں میں شعلہ بیانی کے ساتھ دلائل اور جذبات ایمانی کو حکمت کے ساتھ اپیل کرنے کا انداز پایا جاتا تھا۔ ان کی تقاریر سے اخوان کی دعوت شہروں اور دیہاتوں میں خوب خوب پھیلی۔ وہ حصول منصب سے احتراز کرتے تھے۔ ایک کارکن کی حیثیت سے کام کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔

محمد الغزالی اعتدال ' نرم روی اور تصادم سے اجتناب کے داعی تھے ۔ اخوان کے بعض نوجوان قائدین کا پرجوش انداز ان کے مزاج سے مطابقت نہ رکھتا تھا۔ وہ حسن الھضیبی کے دور میں اخوان سے کنارہ کش ہو گئے مگر نہ تو حکومت کے آلہ کار بنے اور نہ دعوت کا راستہ ترک کیا۔ انھوں نے اپنی انفرادی حیثیت میں نظام اسلامی کے قیام کے لیے اپنی جدوجہد جاری رکھی ۔

شیخ الغزالی تنظیم کے تقاضوں سے بھی بخوبی واقف تھے اور اپنی افتاد طبع ' مزاج اور صلاحیتوں کو بھی اچھی طرح جانتے تھے ۔ یہ ان کی عظمت ہے کہ انھوں نے اپنے نام کی شہرت سے دھوکہ کھا کر کوئی غلط فیصلہ نہیں کیا ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے درمیان اور اخوان کی قیادت اور عام کارکنان کے درمیان وہ بعد اور تلخی پیدا نہ ہوئی جو عموماً تحریکوں سے نکل جانے والی شخصیات اور متوازی تنظیمیں قائم کرنے والی قیادت اور اصلی تحریک کے درمیان جنم لیتی ہے ۔ بعد میں محمد الغزالی اور اخوان کے درمیان پھر قرب پیدا ہو گیا تھا۔ اخوان کے تیسرے مرشد عام سید عمر تلمسانیؒ نے اپنی خود نوشت "یادوں کی امانت" میں اور چوتھے مرشد عام جناب محمد حامد ابوالنصرؒ نے اپنی کتاب "وادی نیل کا قافلہ سخت جاں" میں اس موضوع پر حکیمانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے ۔

شیخ محمد الغزالی نے اپنے پیچھے سیکڑوں وقیع تصانیف چھوڑی ہیں ۔ انھوں نے تفسیر و حدیث پر بھی لکھا' سیرت و تاریخ پر بھی قلم اٹھایا' اور دور حاضر کے فتنوں کا بھی بھرپور تعاقب کیا۔ ان کا پسندیدہ ترین موضوع دعوت اور داعی تھا۔ اس پر ان کی کئی کتب ہیں ۔ شیخ نے دور جدید میں عورتوں کے مسائل' مغربی پراپیگنڈے اور عورتوں کے حقوق کے حوالے سے اسلام دشمن قوتوں کی سازشوں پر بھی خوب لکھا ہے ۔ وہ وسیع المشرب عالم دین تھے ۔ اسلام کے بنیادی اصولوں کو ملحوظ رکھ کر جس قدر انسانی حقوق کی آزادیاں قرآن و سنت نے دی ہیں ان کا بھرپور پرچار کیا کرتے تھے ۔

وہ مصر اور بیرون مصر کی معروف شخصیت تھے ۔ ان کا خطاب سننے کے لیے ہزاروں افراد حاضر ہوتے تھے ۔ بعض اوقات ان کے پیچھے ڈھائی لاکھ لوگوں نے جمعہ کی نماز پڑھی ہے ۔ شیخ کا انداز خطاب بہت سادہ مگر روحانی اور ربانی رنگ سے مالا مال ہوتا تھا۔

حکومت مصر نے "میثاق الوطنی المصری" جاری کیا جس میں سیکولر سیاست اور اشتراکی معیشت کو مسائل کا حل بتایا گیا تھا۔ شیخ محمد الغزالی نے اس کے خلاف زوردار صدائے احتجاج بلند کی ۔ اس پر حکومتی حلقوں نے ان کا خوب مذاق اڑایا ۔ ایک اخبار نے ان کے مخصوص ازہری لباس کو بنیاد بنا کر ان کا مضحکہ خیز کارٹون چھاپا تو شیخ محمد الغزالی کے مداحین نے اخبار کے دفاتر کا گھیراؤ کیا۔ انتظامیہ نے غیر مشروط معافی مانگی اور اگلے روز اخبار میں معذرت شائع کی ۔

شیخ محمد الغزالی نے جامعہ ازہر اور وزارت اوقاف میں خدمات سرانجام دیں اور مصر سے باہر مختلف عرب ممالک میں تعلیمی اداروں میں استاد کے طور پر بھی مصروف عمل رہے مگر جب انھیں مصر

میں وزارت کی پیش کش کی گئی تو انھوں نے معذرت کر دی۔ مکہ معظمہ کی جامعہ ام القریٰ میں بھی استاد رہے اور سعودی عرب کی دیگر جامعات کے بورڈ آف ڈائریکٹرز یا مجلس مشاورت میں بطور ممبر کام کرتے رہے۔ قطر کے شریعت کالج کے قیام اور اس کی ترقی میں مرحوم کا بنیادی کردار تھا۔ سات سال تک وہ الجزائر میں مقیم رہے اور وہاں کی معروف یونیورسٹی جامعہ امیر عبدالقادر میں تدریس و رہنمائی کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ الجزائر میں اسلامی بیداری کی جو لہر نظر آتی ہے اس میں بلاشبہ الغزالی کا بھی اہم کردار ہے۔ وہ کئی سال تک الجزائر ٹی وی پر ہفتہ وار پروگرام پیش کرتے رہے۔ یہ حکیمانہ پروگرام اپنے اندر تعلیم و تربیت اور اسلامی بیداری کے جملہ پہلو لیے ہوتا تھا۔ لوگ اس کا شدت سے انتظار کیا کرتے تھے۔

شیخ محمد الغزالی بہت رقیق القلب انسان تھے۔ اللہ کی رحمت کا تذکرہ کرتے ہوئے یا کسی سے سنتے ہوئے آب دیدہ ہو جاتے تھے۔ ابن عطاء اللہ اسکندری کے پند و نصائح اور حکیمانہ اقوال مصر اور عرب میں بڑے شوق سے سنے اور پڑھے جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ شیخ الغزالی کے سامنے یہ مواعظ بیان کیے گئے تو ایسی رقت طاری ہوئی کہ زار و قطار رونے لگے یہاں تک کہ ہچکی بندھ گئی۔ اس موقع پر شیخ کی زبان پر امام شافعیؒ کا مشہور شعر جاری ہو گیا جسے وہ بار بار دہراتے رہے

تعاظمنی ذنبی فلما قرنته بعفوک ربی کان عفوک اعظما

(میرے گناہوں کا انبار بہت بڑا ہے مگر اے میرے رب جب میں نے اس انبار کا تیرے عفو و درگزر سے موازنہ کیا تو وہ اس سے کہیں عظیم تر نظر آیا)

شیخ محمد الغزالی کو آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ محبت تھی۔ انھوں نے سیرت رسول پر "فقہ السیرہ" لکھی جس کی تالیف کے دوران وہ مسلسل باوضو رہے اور لکھتے ہوئے اکثر اشک بار ہو جاتے تھے۔ ان کی دلی آرزو تھی کہ ان کو آخری آرام گاہ مدینہ منورہ میں نصیب ہو۔ شیخ یوسف القرضاوی نے المجتمع میں تحریر فرمایا ہے کہ شیخ الغزالی آخری دم تک دعوت کے کام میں مصروف رہے، مسافرت میں عین خطاب کے دوران بلاوا آ گیا اس لیے اللہ کی رحمت سے یہی امید ہے کہ انھیں شہدا کے زمرے میں شامل کیا جائے گا۔ ان کا جسد خاکی ان کی خواہش کے مطابق ریاض سے مدینہ منتقل کیا گیا اور جنت البقیع میں امام دار الہجرۃ حضرت امام مالکؒ کی قبر کے بالکل قریب ان کو جگہ نصیب ہو گئی۔ ان دونوں قبروں کے درمیان امام نافعؒ کی قبر ہے جو سات قراء میں سے ایک ہیں۔ اللہ اللہ کس قدر بلند نصیب ہے! زندگی بھی قابل رشک اور موت بھی قابل رشک!

رسائل و مسائل

رسومات میں غیر اسلامی امُور

میری اور میرے دوسرے ہم خیال احباب کی کوششوں سے ہماری برادری نے غیر شرعی اور غیر اسلامی رسم و رواج کو ترک کرنے فیصلہ کیا ہے لیکن خوشی اور غم کے وہ مظاہر جو شریعت کے خلاف نہیں ہیں' مباح ہیں اور ہمارے کلچر کا حصہ ہیں' ان کو باقی رکھنے کا ارادہ ہے۔ ہماری برادری میں جب لڑکی کے والدین' لڑکے کے والدین سے شادی کا وعدہ کر لیتے ہیں تو منگنی کی رسم ہوتی ہے۔ اس میں جو رواج شریعت کے خلاف ہوں اس کی نشان دہی کر دیں تاکہ ہم برادری کے فیصلے کے مطابق ان کو چھوڑ دیں۔ لڑکے والے مٹھائی لے کر لڑکی والوں کے گھر جاتے ہیں جو اپنی حیثیت کے مطابق خاطر مدارت کرتے ہیں اور مٹھائی میں اضافہ کر کے واپس کر دیتے ہیں۔ یہ مٹھائی منگنی کی شہرت کے لیے عزیزوں میں تقسیم کی جاتی ہے۔ لڑکا اور لڑکی پورے کنبہ اور بعض اوقات برادری کی موجودگی میں ایک صوفے پر بیٹھتے ہیں۔ لڑکا لڑکی کو انگوٹھی پہناتا ہے' اس کے بعد عام طور پر لڑکی اس لڑکے سے پردہ شروع کر دیتی ہے۔ منگنی کی تقریب میں فریقین مالی طور پر زیر بار ہوتے ہیں۔ اس نقصان کو پورا کرنے اور خوشی میں شریک ہونے کے لیے قریبی عزیز دونوں کو تحفے دیتے ہیں اور کچھ نقدی دیتے ہیں جس کو سلامی کہتے ہیں۔

آپ نے اپنے خاندان میں شریعت قائم کرنے کا عہد کیا ہے یہ نہایت مبارک قدم ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی علمی اور عملی رہنمائی بھی فرمائے اور ایسی استقامت دے جو دوسروں کے لیے نمونہ بن جائے۔ شادی بیاہ کی رسموں میں اسراف و تبذیر اور فخر و مباہات اور قرضوں کے بوجھ تلے دبا دینے والا معاملہ درست نہیں ہے۔ منگنی کے موقعہ پر استطاعت کے مطابق لڑکے والے لڑکی والوں کے ہاں مٹھائی لے کر آئیں تو درست ہے۔ مٹھائی تقسیم کرنا اور کھانا بطور مہمان کے کھانا صحیح ہے۔ تحفوں کا تبادلہ بھی صحیح ہے۔

لڑکے اور لڑکی کو شادی سے پہلے منگنی کے موقعہ پر ایک صوفہ پر بٹھانا صحیح نہیں ہے۔ یہ خلاف شرع ہے' اس لیے اس رسم کو چھوڑ دیا جائے۔ ایسے موقعہ پر دولہا یا دلہن کو تحفہ دینا' یا ہدیہ دینا صحیح ہے' لیکن نیت یہ نہ ہو کہ اس کا بدلہ دیا جائے۔ جس نے ہدیہ دیا ہے' کل اگر اسے شادی کے موقعہ پر ہدیہ نہ دیا جائے اور حالات اجازت نہ دیتے ہوں کہ وہ بھی بدلے میں ہدیہ دے تو اس پر ناراضی نہ

ہو - ہدیوں کو کھلے عام دینے کی روایت کی بجائے انفرادی طور پر رازدارانہ طریقے سے شادی سے پہلے دے دیا جائے تو زیادہ بہتر ہے - تاہم کھلے طریقے پر دینے کی بھی ممانعت نہیں ہے - شرط صرف یہ ہے کہ اخلاص ہو اور عوض کی طلب نہ ہو - اللہ تعالیٰ آپ جیسے لوگوں کی مساعی کو قبول فرمائے اور اصلاح کا جو سلسلہ شروع کیا گیا ہے اسے کامیابی سے ہمکنار فرمائے - (عبد المالک) -

ناروا پابندیاں اور طلاق

اچھے بھلے دین دار گھرانوں میں یہ مثالیں مل جاتی ہیں کہ شوہر بیوی کو پابند کر دیتا ہے کہ وہ اپنے والدین سے یا بھائیوں سے میل ملاپ نہ رکھے - بعض کسی ناخوش گوار واقعہ کی بنیاد پر حکم لگا دیتے ہیں کہ فلاں سے ملیں تو تین طلاق ۔ ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟

اسلام میں صلہ رحمی کی خصوصی تاکید کی گئی ہے ' اور اسے قرب الہیٰ اور تعلق باللہ کا وسیلہ قرار دیا گیا ہے - ایک مومن اور مسلمان کے لیے جہاں یہ ضروری ہے کہ وہ نمازیں پڑھے ' روزے رکھے ' زکوٰۃ ادا کرے اور حج کے لیے جائے - وہاں اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ شفقت اور رحم کے ساتھ پیش آئے - "رحمٰن ' رحم کرنے والوں پر رحم کرتا ہے" - مخلوق اللہ کا کنبہ ہے - اسی لیے اللہ کو تمام مخلوق سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اس کے کنبہ کے ساتھ احسان سے پیش آئے" - پھر عام مخلوق ' عامتہ الناس ' عامتہ المسلمین اس سے حسن سلوک کا بطور خاص ذکر کیا گیا ہے - اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: آپ سے پوچھتے ہیں کیا خرچ کرو ' آپ کہہ دیجیے جو بھی خرچ کریں ' والدین ' قرابت داروں ' یتیموں اور مسکینوں پر خرچ کرو - رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بے شمار ارشادات میں سے صرف دو ارشاد ملاحظہ فرمائیں:

عائشہؓ سے روایت ہے ' فرماتی ہیں کہ فرمایا رسول اللہؐ نے ' رحم عرش کو پکڑے اس کے ساتھ لٹکی ہوئی ہے - کہتی ہے جس نے مجھ سے تعلق رکھا اللہ اسی سے تعلق رکھے گا اور جس نے مجھ سے قطع تعلق کیا اللہ اس سے قطع تعلق کرے گا - ایک دوسری روایت میں حضرت جبیر بن مطعمؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لَا یَدخل الجنّة قَاطِع" قطع رحمی کرنے والا جنت میں داخل نہ ہو گا -

کسی مسلمان سے عموماً اور قرابت داروں سے خصوصاً کسی شرعی وجہ کے بغیر قطع تعلق ممنوع ہے ' ناجائز ہے اور اسلام اس قسم کی قطع تعلقی کی شدید مذمت کرتا ہے - الا یہ کہ خود شریعت ہدایت کرے کہ فلاں طرح کے آدمی سے میل جول ' اور ہمدردی اور تعلق نہ رکھو مثلاً کفار اور مشرکین اور فساق و فجار سے موالات ' دلی دوستی جائز نہیں ہے اور ان سے تعلقات کے لیے شریعت نے حدود مقرر کر دی

ہیں۔ ان حدود کے مطابق ان سے رابطہ رکھا جا سکتا ہے۔ ان کو نظرانداز کر کے دوستی اور تعلقات قائم کرنا خلاف شرع ہے۔

خوش گوار گھریلو زندگی کے لیے ایک دوسرے کے جذبات کا لحاظ نہایت ضروری ہے۔ جو شوہر بیوی کو اس کے رشتہ داروں سے ملنے سے منع کرے، وہ کس طرح یہ توقع کرتا ہے کہ بیوی اس سے خوش دلی سے حسن سلوک کرے۔ روزمرہ گھریلو امور صرف ضابطہ کے امور تو نہیں، ان میں لطف و راحت تو دل کی کیفیت سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ پھر جو افراد دین کے داعی ہوں، جن کے دین دار ہونے کی شہرت ہو، انھیں بدرجہ اولیٰ یہ خیال رکھنا چاہیے کہ ان کے غلط افعال سے دین کی غلط نمایندگی اور بدنامی ہوتی ہے۔ طلاق جیسے ابغض الحلال کو محض کسی سے ملنے یا نہ ملنے سے مشروط تو جہلا کو بھی نہ کرنا چاہیے کجا کہ پڑھے لکھے لوگ یہ کام کر کے اپنی اور اپنی رفیقہ حیات کی زندگی کو عذاب میں ڈالیں۔ طلاق کے لیے جو طریق کار شریعت نے تجویز کیا ہے، اس میں ٹھنڈے دل سے بار بار سوچنے کا موقع فراہم ہوتا ہے، اسے زبان کی ایک حرکت سے ضائع کر دینا نہایت قابل مذمت ہے۔ طلاق کو کھیل نہ بنانے اور اس کی سنگین نوعیت کے پیش نظر فقہا کا عمومی موقف یہی ہے کہ اس طرح کی شرط پوری ہونے سے طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ اس سے بچنے کے لیے تدبیر ہو سکتی ہے جو کسی عالم دین سے معلوم کی جا سکتی ہے۔ لیکن ایسے شخص کو اچھی طرح تنبیہہ کیا جانا ضروری ہے، خواہ اس کے بزرگوں کی طرف سے ہو، یا برادری یا معاشرہ کے کسی ادارے کی طرف سے۔ (ع - م)

خواتین سے ضروری رابطہ

ٹیلی فون گفتگو کے دوران اکثر مسلمان خواتین ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'' کا جواب دینے کی بجائے خاموشی اختیار کرتی ہیں۔ کیا یہ درست ہے یا غلو کے زمرے میں آتا ہے۔ اسی طرح ٹیلی فون پر ضروری پیغامات دینا ہوتے ہیں، جبکہ خواتین یہ کہہ کر فون بند کر دیتی ہیں کہ مرد گھر پر موجود نہیں۔ اس مسئلے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

مردوں کے لیے عورتوں کو سلام کرنا اور عورتوں کا اس کا جواب دینا سنت سے ثابت ہے۔ امام بخاریؒ نے اپنی کتاب صحیح بخاری شریف میں ''باب تسلیم الرجال علی النساء'' کا مستقل عنوان قائم کر کے اس کے تحت دو روایتیں ذکر کی ہیں۔ ایک حضرت سہل بن سعد ساعدیؓ کی روایت کہ ہم جمعہ کے دن بہت خوش ہوتے تھے۔ ابوحازم نے جو ان سے روایت کرنے والے ہیں، پوچھا آپ کس وجہ سے خوش ہوتے تھے تو انھوں نے جواب دیا: اس لیے کہ ہماری ایک بڑھیا اسی روز چقندر کو جو کے آٹے کے ساتھ ملا کر ہمارے لیے ہنڈیا میں پکاتی تھی۔ ہم جمعہ کی نماز پڑھ کر اس کے پاس آتے اور اسے سلام کہتے، پھر وہ ہمیں چقندر کھانے کے لیے پیش کرتی تھی۔ اسی وجہ سے ہم خوش ہوتے

تھے۔ ہم نماز جمعہ کے بعد کھانا کھاتے تھے اور اس کے بعد آرام کرتے تھے۔ دوسری روایت حضرت عائشہؓ کی ہے۔ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: عائشہؓ! یہ جبرئیل تمھیں سلام کہہ رہے ہیں۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: میں نے کہا "وعلیہ السلام"۔ اس لیے مردوں اور عورتوں کو آپس میں اور اگر فون پر کسی مرد نے سلام کہہ دیا ہے تو اس کا جواب دینا چاہیے۔ جب باقی گفتگو ضرورتاً کی جائے تو سلام بھی ضرورتاً کرنا چاہیے اور اس کا جواب بھی دینا چاہیے۔ بخاری کے محشی لکھتے ہیں: ابن بطال مہلّب سے روایت کرتے ہوئے کہا کہ مردوں کا عورتوں کو سلام کہنا اور عورتوں کا مردوں کو سلام کہنا جائز ہے جبکہ فتنے کا خطرہ نہ ہو۔ کوفہ کے علما کہتے ہیں کہ عورتوں کو سلام کی ابتدا کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ امام مالک کے نزدیک جائز ہے۔ اور دلیل سہل بن سعد کی مذکورہ روایت ہے۔ ہمارے نزدیک راجح جواز ہے۔ لیکن بطال نے جس طرح کہا ہے وہ بالکل درست ہے کہ کوئی بھی جائز کام اس وقت ناجائز ہو جاتا ہے جب کہ وہ ناجائز کام کا سبب بن جائے۔ اسی لیے اگر سلام، نامہ و پیام اور کلام کی کھلی اجازت دی جائے گی تو یہ برائی اور فتنے کا سبب بن جائے گا۔ اسی لیے اس میں مرد اور عورت کے حالات کو مدنظر رکھا جائے گا اور قیود ات کے ساتھ محدود دائرے میں اس کی اجازت دی جائے گی، اور خطرہ ہو تو منع بھی کیا جائے گا۔ لیکن اتنا غلو بھی ٹھیک نہیں ہے کہ فون پر کسی طرف سے سلام ہو تو نیک نیتی کے ساتھ جواب بھی نہ دیا جائے۔ جو خاتون نیک نیتی کے ساتھ خاموشی اختیار کر سکتی ہے وہ نیک نیتی کے ساتھ جواب بھی دے سکتی ہے۔ اگر باقی بات اس نے کرنا ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتی تو پھر صرف وعلیکم السلام کہنے میں کیوں تنگی محسوس کی جائے۔ جواب کی اجازت تو کوفہ کے علما نے بھی دی ہے اور حدیث عائشہؓ سے جواب دینا ثابت ہے۔ واللہ اعلم!

(ع - م)

قربانی کی کھالیں اور خدمتِ خلق

ہم نے ایک ویلفیئر سوسائٹی قائم کی ہے جس کے تحت ہم خدمت خلق کے مختلف کام کر رہے ہیں، مثلاً فری آئی کیمپ، جہاد کشمیر کے لیے پروگرام، معذور طالب علم کے لیے سائیکل کا انتظام، سیلاب کے موقع پر مدد، نادار افراد کا علاج معالجہ، اور فیس اور کتابوں کا انتظام، اسلامی کتابوں کی لائبریری وغیرہ۔ ہم اپنے ویلفیئر فنڈ کے لیے قربانی کی کھالیں بھی جمع کرتے ہیں لیکن بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ ویلفیئر کے لیے قربانی کی کھالوں کی رقم جائز نہیں ہے۔

آپ کا ویلفیئر سوسائٹی قائم کرنا قابل قدر و تقلید ہے۔ اللہ کرے کہ آپ زیادہ سے زیادہ خدمت خلق کا کام کر سکیں۔ زکوٰۃ کی رقوم ایسے کاموں میں لگانی چاہییں جو قرآن پاک میں منصوص ہیں اور جس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ باقی کام نفلی صدقات اور عطیات سے چلائے جائیں۔

مسلمان فقرا اور مساکین زکوٰۃ کا مصرف ہیں ۔ آئی کیمپ ہو یا کشمیری مجاہدین اور مہاجرین 'سب میں فقر اور احتیاج کو ملحوظ رکھ کر انھیں زکوٰۃ دی جائے ۔ کشمیری مجاہدین اور مہاجرین تو ظاہر ہے کہ فقیر اور محتاج بھی ہیں اور جہاد بھی کر رہے ہیں ' لہٰذا ان پر خرچ کرنا دہرے اجر کا موجب ہو گا ۔ اسی طرح غریب طلبہ کو کتابیں لے کر دینا 'فیسوں کی ادائیگی میں تعاون کرنا 'سائیکل لے کر دینا سب جائز ہے ۔ نقد رقم بھی دی جا سکتی ہے ۔ قربانی کی کھالیں اور ان کی رقوم بھی آپ زکوٰۃ کی مدات میں خرچ کر سکتے ہیں ۔ زکوٰۃ کی رقوم کا آپ حساب کتاب الگ رکھیں اور باقی صدقات اور عطیات کا الگ ۔ مذکورہ ضابطہ کے مطابق زکوٰۃ اور چرم ہائے قربانی کی رقوم خرچ کرنے پر علما کا اتفاق ہے ۔ (ع ۔ م)

لذت دعا 'ایک نعمت

ایک بظاہر نہ ختم ہونے والی طویل بیماری میں مبتلا ہوں ۔ دعائیں کرتے کرتے بھی تھک گئی ہوں ۔ لگتا ہے ' اللہ کو شفا دینا منظور نہیں ہے ۔ سوچتی ہوں کہ یہ میرے کن گناہوں کی سزا ہے ۔ پوری پوری رات کرب میں گزر جاتی ہے ۔

آپ کا خط پڑھ کر دل دکھتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مشکل آسان کرے ۔ چند باتیں ہمیشہ یاد رکھیں:

۱ ۔ صحت ہو یا بیماری ' قدرت ہو یا معذوری ' دولت ہو یا فقر ' یہ سب فنا ہونے والی چیزیں ہیں ۔ آخری سانس ان کی آخری حد ہے ' اور آخری سانس کا اعتبار نہیں کہ کب آ جائے ۔ جو بھی حالت ہو وہ امتحان اور تربیت کے لیے ہے ' اور آپ اس سے صحیح فائدہ اٹھائیں تو ابدی نعمتوں میں تبدیل ہو جائے گی ۔ یہ آپ کے لیے بلندی درجات اور ابدی نعمتوں کے حصول کا سامان ہے ۔ اب یہ اللہ کی مشیت ہے — جس کا راز انسانی عقل نہیں پا سکتی — کہ وہ کسی کو دولت سے آزماتا ہے 'کسی کو فقر و فاقہ سے 'کسی کو صحت سے 'کسی کو بیماری و معذوری سے ۔

۲ ۔ ان میں سے کوئی چیز بھی اعمال کا بدلہ نہیں ۔ نہ بیماری گناہوں کا ' نہ صحت عمل صالح کا ۔ شفا میں تعجیل اور جلدی ' یا دیر اور تاخیر بھی اعمال کا نتیجہ نہیں ۔ یہ بھی آپ کا امتحان ہے ۔ اس لیے ایسا ہرگز نہ سوچیں کہ نہ معلوم میں کتنی گناہ گار ہوں کہ خدا مجھے شفا نہیں دے رہا ہے ۔

۳ ۔ ہر دعا نہ فوراً قبول ہوتی ہے ' نہ لازماً قبول ہوتی ہے ' ان معنوں میں کہ دعا کا پھل دنیا میں مل جائے ۔ سب کی دعائیں قبول ہو جائیں تو کارخانہ کائنات اور نظام امتحان درہم برہم ہو جائے ۔ لیکن ہر دعا ان معنوں میں ضرور قبول ہوتی ہے — یہ اللہ کا وعدہ ہے — کہ وہ یہاں نہیں تو آخرت میں اپنا پھل دے گی ۔

۴۔ دعا مانگنا ہی بندگی ہے، دعا عبادت کا مغز ہے۔ خدا سے نہ مانگیں گی، یا اس سے مانگ مانگ کر تھک جائیں گی، پھر کس کے در پر جائیں گی اور کون دے سکتا ہے؟ اپنے سے محبت کرنے والے رحیم و شفیق آقا سے مانگتی جایئے۔ دنیا میں دعا قبول نہ ہو، لذتِ دعا خود ایک بڑی نعمت ہے۔ اس میں انسان کیوں کمی کرے۔ (خرم مراد)

کتاب نما

عہدِ نبوی ؐ کا معاشرہ ' قرآن کی روشنی میں : ڈاکٹر سید محمد اقتصان اعظمی ندوی ' ترجمہ : ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی ۔ ناشر : مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز ' دہلی ۔ صفحات : ۷۰۰ ۔ قیمت : ۱۵۰ روپے ۔

'' بانگ درا'' کی نظم '' بلال'' کا ایک شعر ہے ؎

خوشا وہ وقت کہ یثرب مقام تھا اس کا
خوشا وہ دور کہ دیدار عام تھا اس کا

علامہ اقبال نے ایک جذبہ رشک و حسرت کے ساتھ مدینہ طیبہ کے جس دور کی طرف اشارہ کیا ہے ' بلاشبہ وہ پوری عالمی تاریخ کا سب سے پاکیزہ اور ایک مثالی انسانی معاشرہ تھا۔ یثرب میں اس وقت قبائل کے درمیان شدید قسم کی نفرتیں اور عداوتیں پورے عروج پر تھیں ۔ یہ نبی امی ؐ کی پاکیزہ تعلیمات اور آپ ؐ کی طلسماتی شخصیت کا کرشمہ تھا کہ باہم متصادم قبائل ' شیروشکر ہوکر بھائیوں کی طرح زندگی بسر کرنے لگے ۔ اس مثالی معاشرے کے مرد و زن اللہ کے مطیع و فرماں بردار اور راست باز بندے تھے اور تعاون علی الخیر میں ہر دم ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں کوشاں رہتے تھے ۔ پھر یہ معاشرہ گوناگوں معاشرتی خرابیوں اور برائیوں سے بھی مامون و محفوظ تھا۔ زیرنظر کتاب کے دیباچہ نگار مولانا ابوالحسن علی ندوی سوال کرتے ہیں: ''کیا تہذیبوں کی تاریخ میں کوئی ایسی مثال بھی ملتی ہے کہ کسی گناہ گار یا مجرم نے خود کو عدالت میں پیش کیا ہو ' اپنے اوپر شدید ترین سزا عائد کی ہو اور اسے جھیلا ہو اور اس کے دل میں ذرہ برابر بھی ناپسندیدگی اور نفرت کا احساس پیدا نہ ہوا ہو ' بلکہ اس نے غیروں کی طرف سے دیے جانے والے لالچ اور اشتعال انگیزی کا بھی مقابلہ کیا ہو جیسا کہ حضرت کعب بن مالک ؓ اور ان کے ساتھیوں کے واقعے سے معلوم ہوتا ہے جب وہ غزوۂ تبوک میں شرکت نہ کر سکے تھے اور جیسا کہ عبداللہ بن ابی بن سلول کے صاحبزادے حضرت عبداللہ کے اس رویہ سے عیاں ہوتا ہے جو انھوں نے اپنے باپ کے تئیں اختیار کیا تھا''۔

ڈاکٹریٹ کے زیرنظر مقالے میں مولف نے مدنی معاشرے کا مطالعہ چار ابواب میں پیش کیا ہے :

(۱) تاسیسی مرحلہ ہجرت : اس کے محرکات ' حدود ' مقاصد ' مساجد کا کردار ' مواخات ' جہاد کا تصور '

بدر اور احد۔ (۲) تربیتی مرحلہ: فرد و جماعت کی تربیت۔ اموال غنیمت، واقعہ افک، غزوۂ تبوک۔ (۳) معاشرتی ڈھانچے کی تشکیل نو: نکاح، حرمت زنا، شراب، سود، نظام کفالت، زکوٰۃ، معاشرتی آداب۔ (۴) اقلیات: یہودی، نصاریٰ، منافقین۔ یہ مطالعہ محض مدنی دور کی تاریخ یا احوال و واقعات کے بیان تک محدود نہیں بلکہ مصنف نے اس معاشرے کی صورت گری اور تشکیل نو کے ضمن میں نبی امی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی حکیمانہ تدابیر اور کاوشوں کی تفصیل مرتب و منظم انداز میں پیش کی ہے۔ اس سلسلے میں مولف کا بنیادی ماخذ قرآن حکیم ہے۔ انھوں نے اپنی تحقیق و مطالعے میں قرآن حکیم سے اس یقین و اعتقاد کے ساتھ استفادہ کیا ہے کہ: ''جب بھی تم قرآن کا مطالعہ کرو گے اس سے نئی چیز حاصل ہوگی اور تمھیں ایسا معلوم ہوگا گویا پہلی مرتبہ اس کا مطالعہ کر رہے ہو''۔ (ص ۲۸)

مصنف نے ندوۃ العلماء لکھنؤ سے سند فضیلت حاصل کرنے کے بعد جامعہ ازہر قاہرہ سے "مجمع المدینة المنورة فی عصر النبوة کما یصورة القرآن" کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کیا۔ زیر نظر کتاب اسی تحقیقی مقالے کا اردو ترجمہ ہے۔ موصوف ان دنوں حائل (سعودی عرب) کے تربیت اساتذہ کالج سے وابستہ ہیں۔

یہ کتاب، ایک اعتبار سے سیرت نبویؐ کا مطالعہ ہے۔ مصنف نے سیرت کے ایک خاص پہلو پر ایک نئے انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ اسلامی معاشرے کا یہ نمونہ دور حاضر کے لیے ایک ماڈل کی حیثیت رکھتا ہے (اس لیے علامہ اقبال اسے ''خوشاوہ دور'' اور ''خوشا وہ وقت'' سے یاد کرتے ہیں)۔ (ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی)

رسول اکرمؐ مغربی اہل دانش کی نظر میں، پروفیسر محمد شریف بقا۔ ناشر: مکتبہ تعمیر انسانیت، اردو بازار، لاہور۔ صفحات: ۲۸۰۔ قیمت: ۱۲۰ روپے۔

حضور نبی اکرمؐ کی ذات گرامی ہمارے ایمان کی بنیاد اور ہمارے اجتماعی وجود کی روح ہے۔ حب رسولؐ کے بغیر اسلامی زندگی کی تعمیر ممکن نہیں۔ حضورؐ کی پیروی ہی میں دنیا اور عقبیٰ میں نجات کا راز مضمر ہے۔ عالم انسانیت پر حضورؐ کے احسانات شمار سے باہر ہیں اور ایک زمانہ آپ کے اوصاف حسنہ کا قائل ہے۔ تاہم مغربی مصنفین نے محض تعصب کی بنا پر سیرت نبویؐ کو ہدف تنقید بنایا ہے۔ ان کی پرفریب تحریروں نے بعض تعلیم یافتہ مسلمانوں کو بھی متاثر کیا ہے۔ اس کے باوجود متعصب مستشرقین بھی حضورؐ کے فضائل کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکے۔ ان لوگوں کے اعتراف حقیقت کا ایک فائدہ یہ ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ مگر مغرب سے مرعوب ذہن اپنی فکری گمراہیوں کا جائزہ لینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اغیار کی مثبت آرا سے ہم جیسے لوگوں کے جذبہ ایمانی کو بھی تقویت

ملتی ہے۔ زیرِ نظر کتاب ۵۵ کے لگ بھگ مستشرقین کے بیانات و آراپر مشتمل ہے۔ ان مستشرقین میں لے ایچ پامر، ایڈورڈ گبن، الفرڈ گیوم، این میری شمل، آر نلڈ، کارلائل، ڈریپر، منٹگمری واٹ، لین پول، ولیم میور، واشنگٹن ارونگ، کریمر اور گب ایسے نام نظر آتے ہیں۔ مصنف نے نہ صرف ان کی تصانیف سے اردو میں باحوالہ اقتباسات درج کیے ہیں بلکہ ضرورت کے مطابق اہم مقامات کی توضیح بھی کی ہے اور مستشرقین کی غلط باتوں کی مدلل تردید بھی کی ہے۔

پروفیسر محمد شریف بقا کئی کتابوں کے مصنف اور اپنی راست فکری کے لیے علمی حلقوں میں معروف ہیں۔ اقبالیات سے گہرا شغف رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ توضیحات میں اقبال کے حوالے بکثرت ہیں۔ مصنف نے بڑی تلاش اور محنت سے کتاب کا لوازمہ جمع اور مرتب کیا ہے۔ تاہم بعض مقامات پر کچھ تشنگی کا احساس ہوتا ہے مثلاً ہر مستشرق کا مختصر تعارف دینا مناسب و مفید تھا۔ جان ولیم ڈریپر کی ایک کتاب کے اقتباسات تو شاملِ کتاب ہیں لیکن اس کی کتاب ''معرکہ مذہب و سائنس'' کا تذکرہ مفقود ہے حالانکہ اس میں بھی حضورؐ کے بارے میں اس نے مثبت اور منفی انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔ کتاب میں مندرج اردو ترجمے کے ساتھ ساتھ اگر انگریزی عبارات میں بھی درج کر دی جاتیں تو بہتر ہوتا۔ بہ اعتبار تدوین بعض امور اصلاح طلب محسوس ہوتے ہیں، مثلاً ایک ہی کتاب کے ایک سے زائد اقتباسات کے ساتھ ہر بار کتاب کا نام اور مقام و سنہ اشاعت دہرانے کی ضرورت نہ تھی، صرف صفحہ نمبر کافی تھا۔ مغربی مصنفین کے ناموں کے مختلف اجزا کے درمیان ختمہ لگانا غلط ہے، مثلاً: ''جان۔ولیم۔ڈریپر'' نہیں بلکہ ''جان ولیم ڈریپر'' درست ہو گا۔ ایک مصنف کا نام ایک ہی بار درج کرنا کافی تھا (ص ۷۳ و مابعد) کہیں کہیں آیات اور اشعار میں غلطیاں نظر آتی ہیں، ص ۲، ۱۳، ۱۴۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۷، ۱۷۲، ۲۵۵، ۲۷۶ وغیرہ۔ آیات قرآنی پر اعراب نہیں لگائے گئے، یہ بہت ضروری تھا۔ کتاب کے آخر میں ''کتابیات'' کی ضرورت شدت سے محسوس ہوتی ہے لیکن یہ باتیں کتاب کی افادیت پر کچھ زیادہ اثر انداز نہیں ہوتیں۔ دوسرے ایڈیشن میں ان تجاویز کو ملحوظ خاطر رکھا جا سکتا ہے۔

بحیثیت مجموعی یہ ایک مفید اور معلومات افزا کتاب ہے۔ (ڈاکٹر رحیم بخش شاہین)

چاند اور تارے (تذکرۂ اہل عزم و ہمت)، حافظ محمد ادریس۔ ناشر: مکتبہ الحیات، دین منصور، لاہور۔ صفحات: ۲۵۶۔ قیمت: ۶۶ روپے۔

عظیم شخصیات کے تعارفی خاکے جہاں ادبی قدر و قیمت رکھتے ہیں، وہاں کردار سازی میں بھی بہت موثر ثابت ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے ان خاکوں کی تبلیغی افادیت بھی مسلمہ ہے۔ تبلیغ کا ایک

طریقہ تو یہ ہے کہ آپ جن اصولوں کو انسانی فلاح کا ضامن سمجھتے ہیں ۔ ان کو زبان یا قلم سے دلائل کی بدولت دل و دماغ میں بٹھانے کی کوشش کریں اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ جن لوگوں نے ان اصولوں کے لیے اپنی زندگیاں وقف کیں ان کی شخصیت کے مختلف گوشوں کو اجاگر کیا جائے تاکہ قارئین اس آئینے میں اپنی ذات کا جائزہ لینے کی کوشش کریں اور اپنے اخلاق و کردار کو بہتر سانچے میں ڈھالنے کی سعی کریں ۔

"چاند اور تارے" اہل عزم و ہمت کا ایسا تذکرہ ہے کہ جس کو پڑھ کر انسانیت اور اسلامی تعلیمات پر ہمارا اعتماد پختہ ہوتا ہے ۔ اس تذکرے میں حافظ محمد ادریس کی تیس نگارشات شامل ہیں جن کے ذریعے انھوں نے تحریک اسلامی کے کچھ رہنماؤں اور بعض نمایاں کارکنوں کے اوصاف پر روشنی ڈالی ہے ۔ مصنف نے جن شخصیات کو موضوع بنایا ہے وہ کسی نہ کسی اعتبار سے اپنے معاصرین میں ممتاز اور دوسروں کے لیے لائق تقلید ہیں ۔ ان کی نمایاں ترین خوبی مقصد حیات کے ساتھ والہانہ عشق تھا جب ہم تحریک کے سلسلے میں ان کی حکایت مہر و وفا اور خدمت خلق کے سلسلے میں ان کی گراں قدر مساعی کا حال پڑھتے ہیں تو دل و دماغ پر ایک عجیب اثر ہوتا ہے ' اس کتاب کی ہر تحریر ہمیں زندگی کی مقصدیت اور بے پناہ عزم و حوصلہ سے ہم کنار کرتی ہے ۔ اس اعتبار سے یہ کتاب اعلیٰ مقاصد حیات کے لیے سرگرم عمل لوگوں کے لیے چشمہ قوت کی حیثیت رکھتی ہے ۔ موزوں واقعات کے چناؤ اور ان کی ترتیب اور طرز بیان کی عمدگی نے "چاند اور تارے" کی افادیت اور تاثیر میں بے حد اضافہ کر دیا ہے ۔ تحریکی ادب میں اس کتاب کو ایک مفید اضافہ تصور کیا جا سکتا ہے ۔ (ر ۔ ب ۔ ش)

تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ پر تبصرہ ' سید ابوالاعلیٰ مودودی ۔ ناشر: ادارہ معارف اسلامی ' منصورہ لاہور ۔ صفحات: ۱۷۶ ۔ قیمت: درج نہیں ۔

۱۹۵۳ میں جب اسلامی دستور کے لیے ملک گیر مہم چل رہی تھی ' پنجاب میں قادیانیوں کے خلاف ایک تحریک اٹھ کھڑی ہوئی ۔ جب اس نے شدت اختیار کر لی تو ۶ مارچ ۱۹۵۳ کو مارشل لا لگا کر کثیر تعداد میں لوگوں کو جیل میں ڈال دیا گیا ۔ مولانا مودودی ' ان کے بہت سے قریبی رفقا اور مرکز جماعت سے وابستہ افراد بھی گرفتار کر لیے گئے ۔ مولانا کو "قادیانی مسئلہ" لکھنے کی پاداش میں سزائے موت سنائی گئی ۔ حکومت پنجاب نے جسٹس محمد منیر اور جسٹس ایم آر کیانی پر مشتمل ایک تحقیقاتی عدالت قائم کی جس نے جولائی ۱۹۵۳ سے فروری ۱۹۵۴ تک اپنی تحقیقات کے نتائج ' ۳۸۷ صفحات پر مشتمل انگریزی زبان میں ایک رپورٹ کی صورت میں پیش کیے ۔

زیر نظر کتاب پہلی بار مذکورہ رپورٹ پر بطور تبصرہ شائع ہوئی تھی ' جس پر بطور مولفین نعیم

صدیقی اور سعید ملک کے نام درج تھے، لیکن یہ تبصرہ مولانا مودودی کا تحریر کردہ تھا۔ کتاب ان کے نام سے شائع نہ کرنے میں شاید یہ مصلحت کارفرما تھی کہ مولانا اس زمانے میں جیل میں نظربند تھے۔ کتاب کے اصل مولف کے بارے میں زبانی روایات تو موجود تھیں، مگر کوئی دستاویزی شہادت میسر نہ تھی۔ اب کتاب کا دوسرا ایڈیشن مولانا کے نام سے شائع کیا گیا ہے اور دیباچے میں جناب نعیم صدیقی نے اصل صورت حال کی وضاحت کر دی ہے۔

قادیانیوں کے خلاف ۱۹۵۳ کی تحریک کا پس منظر اور مسئلہ قادیانیت کی تفہیم کے سلسلے میں یہ ایک مفید کتاب ہے۔ سید مودودی نے اپنے مخصوص کلامی انداز میں نہایت عمدگی کے ساتھ رپورٹ کا تجزیہ و تحلیل کیا ہے۔ یہ تاریخی نوعیت کی ایک کتاب ہے۔ آج ۴۰، ۴۲ برس بعد اسے شائع کرتے ہوئے، بعض مقامات پر توضیحی حاشیے شامل کیے جاتے تو قاری کے لیے ان مقامات و مسائل کو سمجھنا آسان ہوتا۔ (ر – د)

غلام عباس : سوانح و فن کا تحقیقی مطالعہ، سویامانے (یاسر)۔ ناشر: سنگ میل پبلی کیشنز، لوئر مال، لاہور۔ صفحات: ۲۹۵۔ قیمت: ۲۱۰ روپے۔

پاکستانی جامعات میں ایم اے اردو اور ایم فل کی سطح پر ہر سال تیار ہونے والے سیکڑوں تحقیقی مقالوں میں بہت کم، بہت ہی کم ایسے ہوتے ہیں، جنھیں ادبی یا سائنسی علوم کی کسی جہت میں فی الواقع "تحقیق" قرار دیا جا سکے۔ اس لیے تحقیقی مقالات کو چھاپنا تو کجا، بعض اوقات چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ع: تو خود بھی شرمسار ہو، مجھ کو بھی شرمسار کر... مگر کبھی کبھی استثنائی مثالیں بھی سامنے آتی ہیں۔ زیرنظر مقالہ اسی طرح کی ایک عمدہ مثال ہے۔

اس کے مصنف ایک جاپانی طالب علم سویامانے ہیں، جنھوں نے پہلے اوساکا میں، پھر پاکستان آ کر، پنجاب یونی ورسٹی، اورینٹل کالج لاہور میں، بڑی محنت سے اردو زبان سیکھی۔ پھر اردو میں لکھنے پڑھنے اور تحقیق کرنے کی ایسی مشق بہم پہنچائی جو بعض اعتبار سے پاکستانی طلبہ کے لیے بھی قابل رشک ہے۔ بے شک وہ فصیح و بلیغ، بامحاورہ اور بے عیب اردو لکھنے پر اہل زبان کی سی قدرت نہیں رکھتے مگر ان کے زیرنظر مقالے کا معیار، ہمارے طلبہ کے لکھے ہوئے مقالوں کے اوسط معیار سے کہیں بہتر ہے۔

غلام عباس (۱۹۰۹–۱۹۸۲) اردو کے نامور افسانہ نگار ہیں۔ اردو کے جید اور نامور نقادوں نے ان پر بیسیوں چیزیں لکھی ہیں۔ اس لیے کسی طالب علم کے لیے اس موضوع پر کوئی نئی بات پیدا کرنا بہت مشکل ہے۔ چنانچہ نہ سہی کہ سویامانے نے غلام عباس کے افسانوں پر کوئی بہت گہری یا تنقیدی نکتہ آفرینی کی ہو، مگر انھوں نے اس موضوع پر دستیاب مطبوعہ اور غیر مطبوعہ لوازمے کو جس

کاوش و محنت سے جمع کیا' (اور اس سلسلے میں کراچی اور دہلی تک کئی بار سفر کیا) پھر سارے لوازمے اور حوالوں کو سائنسی انداز میں مرتب کرتے ہوئے مقالے کی بہت عمدہ تدوین کی' وہ قابل داد ہے۔ غلام عباس کے سوانح پر اب تک کسی نے اس طرح کی تحقیقی نظر نہیں ڈالی اور نہ ان کے فن کا ایسے سائنٹی فک انداز میں تجزیہ کیا ہے۔ کتاب میں غلام عباس کی مطبوعہ و غیر مطبوعہ تحریروں (کہانیوں' خطوں' مسودات) ان کے متعلق تحریروں کی فہارس اور عکس شامل ہیں۔ غلام عباس پر یہ ایک بنیادی کام ہے جو اسی موضوع پر مزید اور مفصل تحقیق کی مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے۔

ایک جاپانی طالب علم کی زیرنظر کاوش سے ہمارے طالب علم بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں' بشرطیکہ وہ اپنے اندر کام کے ساتھ لگن کا جذبہ پیدا کریں اور محنت کو اپنا شعار بنالیں' جو جاپان کی ترقی کا ایک بڑا راز ہے' اور جس کی' افسوس ہے کہ ہمارے ہاں شدید کمی ہے۔ (ر - ہ)

حضرت جبرئیل علیہ السلام' ابن عبدالشکور' ناشر: کوثر پبلی کیشنز' بنگلور۔ صفحات: ۱۸۰۔ قیمت: ۵۶ روپے۔

حضرت جبرئیل علیہ السلام کے بارے میں جو کچھ سیرت کی کتب میں' احادیث میں' اور قرآن میں پڑھا تھا' اسے حسن ترتیب کے ساتھ یک جا اس کتاب میں پڑھا۔ اس پر مستزاد' صاحب کتاب کا دل کش انداز بیان! مصنف نے سیرت نگاری کا میدان اپنے لیے منتخب کر لیا ہے۔ وہ ایسی شخصیات کا انتخاب کرتے ہیں جن پر معلومات بکھری ہوئی ہیں۔ انھیں جمع کرتے ہیں' مرتب کرتے ہیں' رنگ بھرتے ہیں اور پھر پیش کرتے ہیں۔ امہات المومنین حضرت صفیہؓ' اور حضرت جویریہؓ یا حضرت ابوسفیان اور اب حضرت جبرئیل ان کے اسی شوق کا اظہار ہیں۔ زیرتبصرہ کتاب پہلی وحی کی آمد کے منظر سے شروع ہوتی ہی اور آیندہ ہر سال شب قدر میں آمد کے مژدہ پر ختم ہوتی ہے۔ اس دوران سفر معراج میں ساتھ' غزوات میں ساتھ' دشمنان رسولؐ سے رویہ' اور مستند احادیث میں جو جو بھی واقعہ حضرت جبرئیل سے تعلق ہے' سب کو لے کر ایک لڑی میں پرو دیا گیا ہے۔ آپ کی شخصیت کے بارے میں بھی روایات پیش کی گئی ہیں۔ سفر طائف کے بعد پہاڑوں کے فرشتے کو حاضر کرنا اور اسی طرح کی تمام روایات۔ مختصر یہ کہ اس مختصر کتاب کے مطالعے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ سیرت رسولؐ پر کوئی بہت عمدہ کتاب اس لیے پڑھ لی گئی ہے کہ روایتی انداز سے مختلف ہے۔ مشینی کمپوزنگ کے دور میں ہاتھ کی خوب صورت کتابت بھی دل نواز محسوس ہوئی۔ (مسلم سجاد)

حکیم محمد سعید کے طبی مشورے' مرتب: مسعود احمد برکاتی۔ ناشر: ہمدرد فاؤنڈیشن' ناظم آباد' کراچی۔ صفحات: ۳۲۴۔ قیمت: ۱۰۰ روپے۔

ماہ نامہ ''ہمدرد نونہال'' بچوں کا ایک مقبول رسالہ ہے۔ اس میں (دیگر دلچسپ اور بامقصد تحریروں کے علاوہ) حکیم محمد سعید صاحب نونہالوں کے طبی سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔ یہ سلسلہ ۷'۸ برسوں سے جاری ہے۔ حفظ صحت کے موضوع پر یہ سوال جواب نہ صرف نونہالوں بلکہ بڑوں' خواتین اور اطبا کے لیے بھی بے حد فائدہ مند ہیں۔ ''نونہال'' کے فاضل اور لائق مدیر جناب مسعو احمد برکاتی نے' جو ہر کام کو سلیقے اور محنت سے انجام دینے میں مہارت رکھتے ہیں' حکیم صاحب کی ان تحریروں کو ۱۶' ابواب میں موضوع وار جمع کر دیا ہے۔ حکیم محمد سعید ایک ماہر طبیب ہیں' علاج معالجے کا وسیع تجربہ رکھتے ہیں' مگر اہم تر بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں علم نافع عطا کیا ہے۔ وہ اپنی بات قاری تک موثر انداز میں پہنچانے کا فن جانتے ہیں۔ انھوں نے آسان انداز میں مرض' دوا اور تدابیر و پرہیز کی اہمیت اور نزاکتوں کو واضح کرتے ہوئے نہایت مفید مشورے تحریر کیے ہیں۔ ان کا نقطہ نظر بڑا متوازن ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں: ''مٹاپے کا نام صحت نہیں ہے۔ صحت تو یہ ہے کہ آدمی خود کو ہر وقت چست و توانا محسوس کرے۔ اگر دل چاہتا ہے کہ کام کرے' مطالعہ کرے' ورزش کرے وغیرہ' اگر ایسا ہے تو بس یہی صحت ہے''۔ بسیار خوری کو وہ مضر صحت اور باعث امراض سمجھتے ہیں۔ بیماروں کو متوازن غذا اور کم خوری کی ترغیب دیتے ہیں۔ وہ خود ''ایک ناشتا' ایک کھانا'' کے اصول پر عمر بھر کاربند رہے ہیں اور اسی فلسفے کے علم بردار ہیں۔

طرح طرح کے امراض کی کثرت' مہنگی دواؤں اور طریق علاج کی مشکلات اور پیچیدگیوں کے دور میں' زیرنظر کتاب کا مطالعہ بہت مفید رہے گا۔ یہ کتاب ہمیں صحیح' سادہ اور فطری طرز زندگی اختیار کرنے پر راغب کرتی ہے تاکہ دوا اور علاج کی ضرورت کم سے کم پیش آئے۔ کتاب کا معیار طباعت و اشاعت اچھا اور قیمت مناسب ہے۔ (ر-ہ)۔

مجلہ تسخیر' مدیر: صاحبزادہ خورشید احمد گیلانی۔ پتا: ۴۹ کریم بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور۔ صفحات: ۵۶۔
قیمت: ۱۰ روپے' سالانہ: ۱۰۰ روپے۔

ہفت روزہ (مگر عملاً ماہانہ) ''تسخیر''، اتحاد امت' اسلام اور دین و شریعت کے عملی نفاذ اور بڑی طاقتوں کے چنگل سے مسلمانوں کی آزادی کا پرجوش داعی ہے۔ سرورق کے مطابق: ''اتحاد' اجتہاد اور انقلاب کا نقیب''۔ مارچ کے شماروں میں پاکستانی صحافت' عالم اسلام کے خلاف ہنود و یہود کی سازشوں اور اتحاد اسلامی کے بارے میں دل چسپ' معلومات افزا اور فکر انگیز مضامین شامل ہیں۔ ''تسخیر'' میں شامل جملہ تحریروں میں ایک مثبت طرز فکر اور ایک واشگاف لہجہ ملتا ہے۔ (سلیم منصور خالد)

تعارف و خلاصہ آیات قرآنی، پروفیسر شفیق احمد ملک۔ ناشر: طارق برادرز پبلشرز، چوک اردو بازار، لاہور۔ صفحات: ۲۲۴۔ قیمت: ۵۰ روپے۔

مصنف کہتے ہیں کہ وہ، قرآنی آیات کا یہ تعارف اور خلاصہ اس نیت سے پیش کر رہے ہیں کہ معمولی پڑھا لکھا عام مسلمان بھی، تلاوت کرتے ہوئے اس کا مفہوم و مطلب کچھ نہ کچھ سمجھ سکے۔ چنانچہ وہ (بجا طور پر) خیال کرتے ہیں کہ رمضان المبارک میں نماز تراویح کے لیے جانے سے پہلے، زیرنظر کتاب کے ذریعے، اس روز تلاوت کیے جانے والے، حصہ قرآن کا تعارف اور خلاصہ دیکھ لیا جائے تو قرآن فہمی میں بہت مدد مل سکتی ہے۔ انھوں نے ہر سورہ کا خلاصہ، سورہ کو کئی کئی حصوں میں تقسیم کر کے تیار کیا ہے۔ اپنی نوعیت میں یہ ایک مفید کاوش ہے (ر-د)۔

آموز گار اقبال، مرتبہ: ڈاکٹر اکبر رحمانی۔ ناشر: مکتبہ آموز گار، اسلام پور، جلگاؤں (بھارت)۔ صفحات: ۱۳۲۔ قیمت: ۶۰ روپے۔

زیرنظر کتاب تعلیمی جریدے "آموز گار" کے اقبال نمبروں کی کتابی اشاعت ہے جس میں گیارہ تنقیدی مضامین کے علاوہ ۴۸ (بیشتر پاکستانی) مطبوعات پر تعارفی تبصرے شامل ہیں۔ چار کے سوا سب تبصرے مرتب کے قلم سے ہیں۔

حصہ مضامین میں ایک دلچسپ تحریر مراٹھی کے ممتاز ادیب شری پاد جوشی کی ہے۔ ۱۹۴۰ء میں انھوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین سے اردو سیکھی۔ یوں اقبال سے متعارف اور متاثر ہوئے۔ مراٹھی میں کئی مضامین لکھ کر مراٹھی قارئین کو اقبال سے متعارف کرایا۔ کہتے ہیں: "اقبال کے بارے میں میرے دل میں ہمیشہ ایک قسم کی عزت، محبت اور شوق تحقیق رہا ہے"۔ لوگ انھیں ملک کی تقسیم یا تخلیق پاکستان کا ذمہ دار سمجھتے ہیں مگر "مجھ پر اس کا اثر اس لیے نہیں پڑا کہ میں جانتا تھا کہ اقبال، سیاست کی باریکیوں اور گتھیوں کو اچھی طرح جانتے نہیں تھے چنانچہ اس کے بارے میں اقبال کے خیالات کی طرف کوئی دھیان نہ دے گا۔ ان کی شاعری پر ہی ساری توجہ مرکوز کرنی چاہیے"۔ جوشی صاحب نے ایک اور دلچسپ بات یہ بتائی ہے کہ "اقبال کا شیدایا پرستار ہونے کی وجہ سے کئی لوگ تو مجھے مسلم پرست خیال کرنے لگے تھے، یہاں تک کہ طنزاً مجھے مولانا جوشی بھی کہتے تھے، مگر میں نے کبھی اس کا برا نہیں مانا... مجھے تو بڑی خوشی محسوس ہوتی [ہے کہ] میں نے اقبال کے متعلق مضمون لکھے اور تقریریں کیں۔ بس اتنا ہی میرے لیے کافی تھا"۔ (ص ۱۲۷)۔ شری پاد جوشی کے مضمون سے شعر اقبال کی دل کشی و دل آویزی اور (اس واسطے سے) ان کے وسیع حلقہ اثر کا اندازہ ہوتا ہے۔

ڈاکٹر رحمانی کی یہ کاوش قابل داد ہے۔ امید ہے بھارت میں مطالعہ اقبال کے فروغ اور اقبالیات پاکستان کو متعارف کرانے کے سلسلے میں "رموز اقبال" مفید و معاون ثابت ہوگی (ر-د)۔

مدیر کے نام

عبد الرشید بھٹی ' کراچی

اجتماعی اجتہاد (اپریل ۹۶) پر مسلم اقلیت کے ملک سے قابل قدر مضمون آیا۔جہاں مسلمانوں کی حکومتیں ہیں کسی قابل عمل اطمینان بخش طریق کار پر عمل شروع ہو جانا چاہیے۔نئے مسائل پیدا ہونے کی رفتار بہت تیز ہے' اجتہاد کو اس کا ساتھ دینا چاہیے۔

عنایت اللہ ' رحیم یار خاں

مغرب انسانی حقوق (اپریل ۹۶) کا چیمپین بنا ہوا ہے۔ بڑے اطمینان سے دہرے معیار برت رہا ہے۔ ہم اس کا پردہ ہی صحیح طور پر چاک کر دیں تو بڑی خدمت ہوگی۔ الجیریا اور مصر کے ظالم حکمرانوں کے لیے کوئی لفظ ملامت نہیں ہے۔ سربوں اور ہندوؤں کو بھی کھلی چھوٹ ہے۔

محمد طاہر ' حیاسیری ' دیر

چیچنیا کا سبق (اپریل ۸۶) دل میں جگہ کرتا ہے۔ مظلوموں کی داستان پیش کرنا قابل تحسین ہے۔ رشتوں میں تاخیر' سے مسئلہ کی نوعیت خوب اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔

عبد الحی ابڑو ' اسلام آباد

جہاد کی پکار (اپریل ۹۶) بہت موثر و مدلل ہے۔ قرآن مجید کا عربی اردو لغت' کتاب نما (اپریل ۹۶) میں علامہ سیوطی کی کتاب "الاتقان" کو قرآنی کتب لغت میں شمار کیا گیا ہے۔ یہ لغت نہیں' علوم قرآن سے متعلق کتاب ہے۔ نیز امام راغب اصفہانی کی کتاب کا نام "المفردات فی غریب القرآن" ہے' نہ کہ "مفردات غرائب القرآن"۔

ایس - جے - شاھدی ' کراچی

حاجی کے نام' حاجی سے خطاب ہے لیکن اس میں آپ کی دلی کیفیات کا دریا موجزن ہے۔ دل کہتا ہے کہ اللہ آپ کو آیندہ سال قافلہ حجاج میں شریک سفر کرے گا۔

منیر احمد خلیلی ' ابو ظہبی

"حاجی کے نام" واردات و کیفیات دل کا ایک پر تاثیر مرقع ہے۔ اس میں حاجی آپ کے ساتھ ساتھ اور آپ حاجی کے آگے سفر کرتے ہیں اور قاری دونوں کو رشک و عقیدت سے دیکھتا ہے۔

بیرونِ ممالک ترجمان القرآن حاصل کرنے کے لیے رابطہ پتے:

MAKTABA KULLIAH ALHINSAH
JAMIATUL MALAE ABDUL AZIZ
P.O.BOX 9027 JIDDAH
SAUDI ARABIA

SAIFULLAH SANAI
P.O.BOX 9178
DAMMAM 31413
SAUDI ARABIA

ADAAB BOOK SHOP
P.O.BOX 287
MANAMA
BAHRAIN

ANAYAT HUSSAIN GHAURI
P.O.BOX 382
ABU DHABI
UAE

MANZOOR ILAHI
P.O,BOX 621
DUBAI
UAE.

MR.MUHAMMAD SALAHUDDIN
DARUL SAUDIA JAUHARIA
AL BAGHDADIA BUILDING
P.O.BOX 2043
JEDDAH-21451

UMER ABDUL AZIZ
755-EAST 9 STREET#.B.6.
BROOKLYN
NEW YORK-11230(U.S.A)
✆ (781)421-5428

ISLAMIC BOOK CENTER
120,DRUMMOND ST.
LONDON N.W.I 2HL
UK.

UK ISLAMIC MISSION
121,OAKLAND ROAD HANWELL
LONDON W7 2DT
UK.

UK ISLAMIC MISSION
401-403,ALUM ROCK ROAD
BIRMINGHAM B-8 3DT
UK.

UK ISLAMIC MISSION
19- CARRINGTON STREET
GLASGOW G4 9AJ
UK.

UK ISLAMIC MISSION
1 TYDFIL PALACE
ROTH PARK CARDIFF
SOUTH WALES UK.

SYED SHAUKAT ALI
DEPT. OF COMMUNICATIONS
INTL.ISL.UNI. P.O.BOX 70
JALANJAN 46700-PJ SELANGER
MALAYSIA

RAFAY SAMAN
423,BARA MUGH BAZAR
ELEPHANT ROAD DHAKA
BANGLA DESH

دیگر ملکوں میں بھی خواہشمند رابطہ کریں:

مینیجر ترجمان القرآن، ۵-اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور 54600 فون 042-7587916

حسین فاروق مودودی نے ملک عید محمد پرنٹرز سے چھپوا کر ۵-اے ذیلدار پارک 'اچھرہ' لاہور سے شائع کیا

نقصان دہ ہے۔ الجیریا کی غیر معمولی اہمیت ہے۔ یہاں کے حالات مغربی یورپ اور مشرق وسطیٰ پر اثرانداز ہوں گے۔ ہمیں بنیاد پرستوں کی حکومت کسی بھی جگہ گوارا نہیں ہونی چاہیے: مصر میں' ترکی میں' اردن میں یا فلسطینیوں کی قیادت میں۔

دوسری تدبیر کے طور پر مغرب کو سوڈان اور ایران پر دباؤ ڈالنا چاہیے کہ ان کی جارحیت کم سے کم تر ہو۔ ہمارے ہاتھ میں اقتصادی اور سفارتی ہتھیار ہیں اور فوجی متبادل بھی ہروقت موجود ہے۔

تیسرے' ہمیں ایسے اداروں اور افراد کی مدد کرنا چاہیے جو بنیاد پرستوں کی لعنت کے خلاف کھڑے ہیں۔ رشدی کے واقعہ کے بعد سیکولرسٹ مسلمان مشرق وسطیٰ میں ایک بڑی مصیبت میں ہیں۔ بنیاد پرستوں کے مخالف مسلمان ہماری طرف امید کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ ہمیں اپنا رسوخ اور مال و دولت ان بہادر آدمیوں کی حمایت میں استعمال کرنا چاہیے۔

آخری بات یہ کہ ہمیں جمہوریت کے بارے میں بہت محتاط رہنا چاہیے۔ انتخابات اور جمہوریت کو ہم معنی سمجھ لیا گیا ہے۔ ہمیں اس کے بجائے سیاسی شرکت' قانون کی بالادستی' مذہب اور رائے کی آزادی اور اقلیتوں کے حقوق دینے پر زور دینا چاہیے۔ پہلے امن' پھر مہذب معاشرہ پھر انتخابات! اگر انتخابات میں جلدی کی جائے تو الجیریا کی طرح جمہوریت دشمن آگے آجاتے ہیں اس لیے کہ وہ زیادہ منظم ہیں اور ووٹر صحیح فیصلہ نہیں کر پاتے۔

جان ایسپوسیتو ' ڈائرکٹر مسلم عیسائی مرکز' جارج ٹاؤن یونیورسٹی

سیاسی اسلام کو جسے بنیاد پرست اسلام کہا جاتا ہے' مشرق وسطیٰ کے استحکام کے لیے اور مسلم دنیا میں مغربی مفادات کے لیے خطرہ قرار دیا جاتا ہے۔ ایرانی انقلاب اور اس کے بعد ہونے والے متعدد واقعات نے عالمی سیاست میں اسلام کی جارحانہ پیش قدمی کے احساس کو تقویت دی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انقلاب ایران نے ہماری سوچ کو اس قدر متاثر کیا ہے کہ ہم آج دنیائے اسلام میں رونما ہونے والے واقعات کو اس سے آزاد ہو کر نہیں دیکھ سکتے۔

سعودی عرب' ایران' پاکستان اور دوسرے مسلم ممالک کی حکومتوں میں سے ہر ایک کا اسلام سے تعلق کا اپنا انداز ہے۔ کچھ ہمارے دوست ہیں اور کچھ ہماری دہشت گرد فہرست میں۔ اب ہم میں سے بہت سے یہ کہتے ہیں کہ ہم اسلام یا اسلامی تحریکوں کو لازماً مسئلہ نہیں سمجھتے' ہم صرف انتہاپسندوں کو مسئلہ سمجھتے ہیں۔ دنیا میں بہت سی مسلمان حکومتیں اور اسلامی تحریکیں ہیں۔ ان میں سے کچھ سیاسی نظام کا حصہ ہیں۔ ایک اقلیت انتہاپسند ہے اور اپنی حکومتوں کا تختہ الٹنے کا پروگرام رکھتی ہے۔ کچھ مغرب دشمن ہیں۔ ہمیں انتہاپسندوں اور حقیقت پسندوں میں فرق کرنا چاہیے۔

ماہنامہ افکار معلم

سعودیہ 20 ریال - پاکستان -/100 روپے، ۷۴ ایبک پارک ۳ بہاول شیر روڈ مزنگ - لاہور

ماہنامہ ہمقدم

پاکستان میں طلبہ کے جمہوری حقوق ترجمان -

سعودیہ -/400 روپے - پاکستان -/75 روپے، A-1 ذیلدار پارک اچھرہ لاہور فیکس: 7572310

ماہنامہ پکار

اسلامی جمعیت طالبات کا ترجمان -

سعودیہ -/250 روپے - پاکستان -/120 روپے، C-91 بلاک ۱۱ فیڈرل بی ایریا - کراچی

ماہنامہ پیغام ڈائجسٹ

سعودیہ -/250 روپے - پاکستان -/80 روپے، ۸۹ فیروز پور روڈ - اچھرہ - لاہور

ماہنامہ خواتین میگزین

سعودیہ 80 ریال - پاکستان -/150 روپے، کمرہ نمبر ۶، ۴۲ چیمبر لین روڈ - لاہور

ماہنامہ المصباح

عربی مدارس کے طلبہ کا ترجمان -

سعودیہ -/400 روپے - پاکستان -/70 روپے A-1 ذیلدار پارک اچھرہ - لاہور

کشمیر المسلمہ

سعودیہ 20 ڈالر - پاکستان -/300 روپے، پروفیسر الیف اللہ بن ترابی - بکس 2292 اسلام آباد -

فون: 813856 فیکس: 213625، اکاؤنٹ ڈالر 1155-701547 بنک الامارات - اسلام آباد

رسالے ذہن بناتے ہیں، حالات سے آگاہ کرتے ہیں - نقطہ نظر دیتے ہیں، جذبہ عمل دیتے ہیں، زرِ سالانہ ارسال کرنے میں بخل سے کام نہ لیں - دوستوں کے نام جاری کروائیں، یہ خیر خواہی کی بہترین شکل ہے - (عطیہ اشتہار)



دانتوں کی صفائی اور مسوڑھوں کی صحت کے لیے انتہائی موثّر نباتاتی

مسواک ہمدرد پیلو ٹوتھ پیسٹ

اچھی صحت کا دار و مدار صحت مند دانتوں پر ہے۔ اگر دانت خراب ہوں یا عدم توجہی کے باعث گر جائیں تو انسان دُنیا کی بہت سی نعمتوں اور لذتوں سے لُطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ زمانۂ قدیم سے صحتِ دندان کے لیے انسان درختوں کی شاخیں بطور مسواک استعمال کرتا آیا ہے۔ ہمدرد نے تحقیق و تجربات کے بعد دارچینی، لونگ، الائچی اور صحتِ دہن کے لیے دیگر مفید نباتات کے اضافے کے ساتھ "مسواک ٹوتھ پیسٹ" تیار کیا ہے جو دانتوں کو صاف اور سفید رکھنے کے ساتھ مسوڑھوں کو بھی مضبوط، صحت مند اور محفوظ رکھتا ہے۔

سارے گھر کا ٹوتھ پیسٹ

مسواک ہمدرد پیلو ٹوتھ پیسٹ

مسواک کے قدرتی خواص، صحتِ دنداں کی مضبوط اساس

ہمدرد

مدینۃ الحکمۃ تعلیم، سائنس اور ثقافت کا عالمی منصوبہ۔

آپ ہمدرد دوست ہیں۔ اعتماد کے ساتھ مصنوعاتِ ہمدرد خریدتے ہیں۔ جائز منافع بین الاقوامی شہر علم و حکمت کی تعمیر میں لگ رہا ہے۔ اس کی تعمیر میں آپ بھی شریک ہیں۔

حضرت ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے نزدیک مرتبے کے لحاظ سے بدترین شخص وہ ہوگا جس نے دوسرے کی دنیا بنانے کی خاطر اپنی آخرت برباد کر دی۔

(ابن ماجہ)

SAMA-O-BASAR

سمع و بصر

گفٹ سکیم تعارف

سمع و بصر
علی ہاؤس، ۹، کمرشل زون
کریم بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور
فون: 5411546
فیکس: 5419541

رمضان المبارک اور پھر عید کے موقع پر اپنے احباب اور ننھے بچوں کے لئے تحائف بھیجیں۔ ہر تحفے کے ساتھ ایک تہنیتی کارڈ بھی آپ کے پیغام کے ساتھ بھیجا جائے گا۔

سدا بہار کیلنڈر

پانچ رنگوں میں، پُروقار، دیدہ زیب طباعت
31 صفحات، ہر صفحہ پر اردو ترجمہ قرآن/حدیث

ترتیب: پروفیسر مسلم سجاد
تدوین: پروفیسر عنایت علی خان

زرِ تعاون: 90 روپے



کتاب کہانی نمبر 1

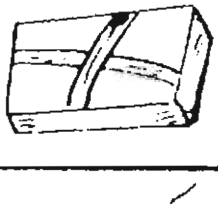
ایک کیسٹ کے ساتھ 4 خوبصورت کتابیں
بچوں کے لئے نئے انداز میں نئی کوشش، لفظ بہ لفظ دلنشیں انداز، پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ





زرِ تعاون 85 روپے

دس آڈیو کیسٹ



خوبصورت گفٹ پیک میں، پسند آپکی اپنی، ہمیں صرف عنوانات بتا دیں، تحفہ بھی، تعلیم بھی۔

زرِ تعاون 225 روپے

VHS ویڈیو کیسٹ

نیشنل جاپان، گفٹ پیک میں، ہماری فہرست سے عنوان پسند کریں۔
تحفہ بھیجنے کا نیا انداز

زرِ تعاون: 200 روپے

تفصیلات کے لئے رابطہ کیجئے:
زرِ تعاون بذریعہ بنک ڈرافٹ، منی آرڈر یا نقد وصول کیا جائے گا۔ چیک کی صورت میں چیک کیش ہونے پر تحفہ روانہ کیا جائے گا۔